



منصوب ساز

اشتیاق احمد

پھول

انپیکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزاد ایوان صدر پہنچے،
تو وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ بڑے بڑے تمام آفیسر
جمع تھے۔

”او جمشید! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ صدر
صاحب مسکرائے۔

”لیکن سر! میں تو بالکل وقت پر پہنچا ہوں۔“ انپیکٹر
جمشید نے فوراً اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”ہاں! تم بالکل درست وقت پر پہنچے ہو۔“ اس
لیے کہ تمہیں یہی وقت دیا گیا تھا۔ تم بالکل درست وقت
پر پہنچنے کے عادی ہو نا۔ ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں
رکھتے، جب کہ دوسرے حضرات عام طور پر لیٹ آتے
ہیں۔ لہذا دوسروں کو آنے کا وقت آدھ گھنٹا پہلے کا
دیا تھا اور تمہیں بعد کا۔ لیکن اتفاق دیکھو کہ آج یہ

سامان کیا گیا ہے۔ یہ وہ معلوم نہیں کر سکے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ہو گا یہ کام افتتاح کے دوران۔
 "تو آپ افتتاح نہ کریں۔"

"پھر میری جگہ جو بھی افتتاح کرے گا۔ وہ مارا جائے گا۔" صدر صاحب بولے۔

"ٹھیک ہے۔" انپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا ٹھیک ہے؟"

"آپ کے ایک آپ میں یہ افتتاح میں کروں گا۔ اگر آپ اس کی اجازت دیتے ہیں۔"

"بھلا میں تمہیں موت کے منہ میں جانے کی اجازت کس طرح دے سکتا ہوں۔" صدر صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"اگر میرا وقت آ گیا ہے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں بھئی۔ میں یہ اجازت نہیں دے سکتا۔ کچھ

اور سوچو۔ افتتاح بہر حال کیا جائے گا، کیونکہ اس کے

اطلاعات ساری دنیا میں ہو چکے ہیں۔ بلکہ ایک ملک نے

تو اس خطرے کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ شاید

اس نمائش پر افتتاح کے دوران اس ملک کے صدر

کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان حالات میں میں نہیں

سب حضرات بالکل درست وقت پر آ گئے اور اس طرح ہمیں تمہارا آدھ گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا۔"

"اوہ! تب تو آپ مجھے فون کر دیتے؟"

"فون کیا تھا جمشید۔ لیکن تم گھر سے تو اس سے

بھی پہلے کے نکلے ہوئے تھے اور تمہیں درمیان میں بھی

کوئی کام تھا۔ یہ بات بھابی صاحبہ نے بتائی تھی۔

لہذا ہم نے تمہیں فون کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ورنہ فون

تو تمہیں تم جہاں بھی ہوتے، کیا جا سکتا تھا۔"

"خیر۔ اب تو یہ ہو گیا۔ یہ بتائیں۔ آپ سب

ناموش کیوں ہیں؟"

"اکیس مارچ کو ہمارے ملک میں بین الاقوامی چھوٹوں

کی نمائش ہو رہی ہے۔ ان گنت ملک اپنے اپنے

بہترین پودے اس نمائش میں لا رہے ہیں۔ اس نمائش

کا افتتاح مجھے کرنا ہے جمشید۔" صدر صاحب نے بتایا۔

"تو کیا اس میں کوئی آئین ہے؟"

"ایک دشمن ملک سے ہمارے ایجنٹوں نے خفیہ رپورٹ

ارسال کی ہے۔ اس میں درخواست کی گئی ہے کہ میں

یہ افتتاح ہرگز نہ کروں۔ اس لیے کہ اس نمائش میں

میری موت کا سامان بالکل تیار ہے۔ موت کا کیا

رک سکتا۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی۔ میں نے موت کے
ڈر سے افتتاح نہیں کیا۔ اور اپنی جگہ مرنے کے لیے
کسی دوسرے کو بھیج دیا۔

”تو میں کز تو رہا ہوں سر۔ آپ اپنی جگہ مجھے
جانے دیں۔“

”نہیں جمشید۔ میں نے۔ بلکہ ہم سب نے کچھ اور

سوچا ہے۔“

”چلیے۔ وہ بتا دیں۔ جو آپ نے سوچا ہے۔“ انپکٹر
جمشید مکر دے۔

”سوچا یہ ہے کہ تم وہاں قدم قدم پر میرے ساتھ
رہو۔ دراصل وہاں صرف مجھے ہلاک کیا جائے گا۔
میرے ساتھ اور لوگوں کو نہیں ہلاک کیا جائے گا۔
اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی رخ سے وار صرف
مجھ پر کیا جائے گا اور تم اس وار کو روک سکتے ہو۔
یہ تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں۔“

”بشرطیکہ وار کیا جائے۔ اور اگر انھوں نے کوئی اور
ترکیب سوچی ہوئی ہو گی تو؟“

”اس صورت میں بھی تم میرے ساتھ ساتھ رہو گے
نا۔“ صدر صاحب بولے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے محفوظ ترین طریقہ یہ
تھا کہ آپ اپنے ایک آپ میں مجھے جانے دیں۔“

”ہوں۔ خیر۔ باقی لوگوں سے مشورہ لے لیتے ہیں۔
کیوں بھی۔ آپ کوئی مشورہ دیتے ہیں؟“

”یس سر۔ کیوں نہیں۔ اس ترکیب سے کم از کم دشمن
بالکل ناکام ہو جائے گا۔“

”لیکن اگر انپکٹر جمشید مارے گئے تو میرے نزدیک یہ
بھی دشمن کی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اس ملک کے
لیے میری نسبت انپکٹر جمشید زیادہ اہم ہیں۔“

”یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر۔ میں بھلا کس
قابل ہوں۔“

”یہ بات ہم جانتے ہیں جمشید۔ پورا ملک جانتا ہے۔
صدر صاحب جذباتی انداز میں بولے۔

”ہوں خیر۔ آپ فیصلہ کریں۔“

”وہ آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر صدر صاحب نے سر
اٹھایا اور بولے۔“

”نہیں جمشید طے یہی ہوا ہے کہ تم میرے ساتھ ساتھ
رہو گے اور دشمن کے وار کو ناکام بناؤ گے۔“

”تب پھر افتتاح سے پہلے بھی ہمیں وہاں کا معائنہ

ملکوں سے پھولوں کے پودے لائے گئے تھے۔ اور پھول
ہی پھول ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ پھولوں کے تختے عجیب
بہار دکھا رہے تھے۔

اس کام میں انھیں کئی گھنٹے لگ گئے، لیکن کہیں
کسی گڑ بڑ کے آثار نظر نہ آئے۔

"ہو سکتا ہے، وہ رپورٹ ہی غلط ہو۔ یہاں کوئی
خطرہ سرے سے ہو ہی نہ" محمود بڑ بڑایا۔

"ہمارے ایجنٹ غلط رپورٹ نہیں بھیج سکتے۔" فاروق نے
منہ بنایا۔

"لیکن ان سے غلطی تو ہو سکتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ختم کر دو بھی۔ اب اصل بات نمائش والے دن
ہی معلوم ہو گی۔"

اور وہ وہاں سے چلے آئے۔ یوں وہاں حفاظتی انتظامات
بے تحاشہ کیے گئے تھے۔ نمائش گاہ کے چاروں طرف فوج
کا زبردست پہرہ تھا۔ اور کوئی غیر متعلقہ آدمی اندر
نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ انھیں بھی اپنا تعارف کرانا
پڑا تھا۔ کارڈ دکھانا پڑے تھے۔ تب کہیں جا کر انھیں
اندر داخل ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔

اور پھر نمائش کا دن آ پہنچا۔ چاروں وقت سے

کرنے کی اجازت دی جاتے۔

"تمہیں ہر طرح اجازت ہے۔ خوب اچھی طرح چیک
کرو۔ ویسے ایک بات یقینی ہے۔ نمائش گاہ میں بم
دھماکا نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ میرے ساتھ ہر اس
ملک کا نمائندہ ہو گا۔ جس ملک کے پھول وہاں رکھے
ہوں گے۔ لہذا بم دھماکے کی صورت میں تو اس
ملک کا نمائندہ بھی اڑ سکتا ہے۔"

"چلیے میں مان لیتا ہوں۔ وہ بم دھماکا نہیں کریں
گے۔ لیکن سیدھا آپ پر فائر تو ہو سکتا ہے۔"

"فائر تو مجھ پر کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس
کے لیے پھولوں کی نمائش کیوں؟ صدر صاحب بولے۔

"یہ سوال بہت اہم ہے اور غور طلب ہے۔ آخر
پھولوں کی نمائش ہی کیوں منتخب کی گئی؟"

"تو پھر تم اس پر غور کرو۔ غور کے لیے تمہارے
پاس وقت ہے۔ اور نمائش گاہ کی چیکنگ کے لیے بھی
بہت وقت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھ لوں گا۔"

اُسی شام انھوں نے نمائش گاہ کا معائنہ کیا۔ بہت
غور سے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ وہاں قریباً ایک سو

پہلے ہی صدر صاحب کے ہاں پہنچ گئے :

"ہائیں اتم تو میرے گھر ہی آگئے۔"

"ہم یہیں سے حفاظتی اقدامات کا جائزہ لیں گے اور آپ کے ساتھ رہیں گے۔"

"تم نے نمائش گاہ کا معائنہ کیا تھا جمشید؟"

"جیس سر۔ وہاں قطعاً کوئی گزراڑ نہیں ہے سر۔"

"بہت خوب ! اس کا مطلب ہے۔ خبر غلط تھی۔"

"یہ نہیں کہا جاسکتا سر۔ کیونکہ ابھی تک آپ نے افتتاح نہیں کیا۔"

"اوہ ہاں ! یہ بھی ہے۔ وہ بولے۔"

پھر صدر صاحب اور دوسرے آفیسر آگے پیچھے وہاں سے نکلے اور اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ گئے۔ انپیکٹر جمشید،

محمود، فاروق اور فرزاد کو صدر صاحب کی کار میں بٹھایا گیا۔ صدر صاحب پچھلی سیٹ پر تھے۔ محمود، فاروق اور

فرزاد ان کے ساتھ تھے اور انپیکٹر جمشید اگلی سیٹ پر تھے، ان کی نظریں بجلی کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔

اُسی حالت میں وہ نمائش گاہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں فوجی بینڈ سے ان کا استقبال کیا گیا۔

انپیکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔ یہ طریقہ اسلامی نہیں

تھا۔ انگریزوں کا تھا۔

"سر۔ نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد آپ اندر جائیں گے۔ تمام پودوں کو خود سے دیکھتے ہوئے گزریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ! ٹھیک ہے۔ تو پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ کہ آپ کسی پودے کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"کیوں جی۔ اس میں کیا حرج ہے۔ بعض پھول

اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انھیں فوڈا چھونے کو دل کرتا ہے۔"

"اگر ہمیں خفیہ رپورٹ نہ ملی ہوتی تو میں آپ کو چھونے سے ہرگز نہ روکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ اگر تم کہتے ہو تو نہیں چھوؤں گا۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔"

وہ نمائش گاہ کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔

ایک ملٹری آفیسر نے ان کی کار کے دروازے کھولے اور ساتھ میں سوٹ بھی کیا۔ دروازے کے بالکل اندر

ہی فیتہ لگایا گیا تھا۔ صدر صاحب کو قینچی پیش کی گئی، انھوں نے فیتہ کاٹ دیا اور سب لوگ تالیاں بجانے

لگے۔ لیکن انپیکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزاد تالیاں

نہیں بجا رہے تھے۔ انھیں یہ غیر اسلامی طریقہ پسند نہیں تھا۔ آخر تالیوں کی گونج میں صدر آگے بڑھے۔ ان کے دائیں طرف انیکٹر جمید تھے، بائیں طرف محمود تھا، فاروق اور فرزاد پیچھے تھے۔ پھر دوسرے آفیسر تھے۔ ہر ملک کے پھول الگ سجائے گئے تھے۔ گویا صدر صاحب کو ایک ایک ملک کے پھولوں کے پاس سے گزرتا تھا۔ انھیں اچھی طرح دیکھنا تھا۔

وہ گزرتے رہے۔ حیرت زدہ انداز میں پھولوں کو دیکھتے رہے۔ اس قدر عجیب و غریب قسم کے پھول شاید انھوں نے اپنی زندگی میں پہلے نہیں دیکھے تھے۔ سب لوگوں کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ وہ دیکھتے رہے، گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جگہ جم کر رہ گئے۔

”اُف مالک۔ اس قدر خوب صورت اور اتنا پیارا پھول اور بالکل سیاہ رنگ کا۔ میں نے زندگی میں پہلے نہیں دیکھا۔“ صدر صاحب نے کہا۔

”سر! یہ دلیریاں کا ہے۔ دلوں کا مشہور ترین اور سب سے خوب صورت پھول۔ یہ ہے بھی سدا بہار۔ لیکن ایک بلودے پر صرف ایک پھول لگتا ہے۔ جب وہ مرجھا جاتا ہے تو اس کے بعد دوسرا پھول نکلتا ہے۔ اور

سر۔ کہتے ہیں۔ اگر اس پھول کو چھو لیا جائے۔ تو نظر زندگی بھر کمزور نہیں ہوتی۔ اگر کسی کی نظر کمزور ہو تو کمزور ہی دور ہو جاتی ہے۔“

”بہت خوب! تب تو اسے میں بھی چھوؤں گا۔“ صدر صاحب بے اختیار انداز میں آگے بڑھے۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر؟“ انیکٹر جمید نے دہی آواز میں گویا انھیں یاد دلایا۔

”مجھے یاد ہے بھئی۔ لیکن میں اس میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتا۔ یہ کہ کر وہ آگے بڑھے۔“

”اگر آپ اس کو چھونا ہی چاہتے ہیں سر۔ تو پھر پہلے مجھے اپنا کام کر لینے دیں۔“ انیکٹر جمید ان کے داستے میں آگئے۔ صدر صاحب کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نظر آئے، لیکن پھر فوراً ہی وہ مٹا دیے۔

”اچھی بات ہے۔ کرو۔ کیا کرنا چاہتے ہو؟“

وہ اس شخص کی طرف بڑھے جس نے پھول کا تعارف کرایا تھا۔

”کیا آپ دلیریاں سے اس پھول کے ساتھ ہی آئے ہیں؟“

”ہاں! اس کی حفاظت کے لیے مجھے ساتھ بھیجا گیا ہے۔“

”بہت خوب! آپ کی آنکھوں پر بینک کیوں ہے؟“

انیکٹر جمید بولے۔

”جی۔ کیا مطلب؟“

”ابھی آپ نے بتایا ہے کہ اس پھول کو چھونے سے نظر کی کمزوری دور ہو جاتی ہے۔ نظر کی کمزوری دور کرنے کا یہ تو بہت آسان ترین نسخہ ہو گیا۔ پھر آپ نے اپنی نظر کی کمزوری کیوں دور نہیں کی؟“

”میری نظر کمزور نہیں ہے۔ یہ دھوپ کا چشہ ہے۔“

”اچھا کمال ہے۔ خیر۔ ہو گا۔ ذرا آپ اس پھول

کو چھو کر دکھائیں۔“

”میں چھو کر دکھاؤں۔ کیا مطلب؟“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ آپ نے اس پھول کو چھونے کے فائدے گنوائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں۔ صدر صاحب کے چھونے سے

پہلے آپ اسے چھو دیں۔“

”یہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ اس نے جھٹکا کر کہا۔“

”اس میں عجیب بات کوئی نہیں۔ ہم احتیاطاً ایسا کر

رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں اطلاعات ملی ہیں۔ پھولوں

کی اس نمائش میں ہمارے ملک کے صدر کو ہلاک کرنے کی

کوشش کی جائے گی۔ اور میں یہ بات جانتا ہوں۔ دنیا

میں کچھ پودے انتہائی زہریلے ملتے ہیں۔ اس حد تک زہریلے بھی کہ اگر ان کو صرف چھوا جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔“

”نہن۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں جناب۔“

”تو پھر مہربانی فرما کر پھول کو چھولیں۔“

”نہن۔ نہیں۔“

اس نے خوف زدہ انداز میں کہا اودوہ سب حیرت زدہ رہ گئے۔

"یہ کیا بکرا۔ ایک مہمان ملک کے نمائندے سے آپ
یہ سلوک کر رہے ہیں۔"

"لیکن مہمان ملک کے نمائندے کو بھی تو ہمارے
ملک کے صدر کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کوئی حق
نہیں ہے۔"

ٹام روڈ

"یہ کیا بات ہوئی۔ آپ اس پھول کو چھونے سے انکار
کر رہے ہیں۔ جب کہ ابھی مجھے چھونے کی دعوت دے
رہے تھے۔" صدر صاحب نے مارے حیرت کے کہا۔

"مم۔ میں۔ میں۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کر سکا۔"

"دیکھیے جناب۔ پھول کو تو آپ کو اب چھونا ہی پڑے
گا۔" انپکٹر جمشید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ اس نے پیچھے کر کہا۔ اور اپنا ہاتھ
پھڑانے کے لیے زور لگانے لگا۔

"ارے چھٹی۔ اس میں ایسی بھی کیا بُری بات ہے،
سادہ زندگی آپ کی نظر کمزور نہیں ہو گی۔"

"میری نظر پہلے ہی بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا۔ یہ بات ہے۔" انپکٹر جمشید نے کہا اور پھر انھوں

نے اس کی سینک اتار لی۔

"کیا کہا آپ نے؟" بہت سی آوازیں ابھریں۔
"ہاں! میں غلط نہیں کر رہا۔ اس پودے میں صدر
صاحب کی موت کا سامان تیار ہے۔"

"کیا!! وہ چلائے۔"

"اگر یقین نہیں۔ تو اس کے چہرے کی طرف دیکھ
لیں۔ اسے مسٹر۔ بتاؤ۔ وہ سامنے کس کے پھول
کھنٹے ہیں؟"

"لگ۔ کس طرف؟"

"اس طرف۔ سامنے۔ تمہاری آنکھوں کی سیدھ میں۔"
"اس طرف۔ یہ۔ زرد رنگ کے۔"

اور سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس لیے کہ وہاں
بالکل سفید پھول تھے۔

"یہ اس کی نظر کی ہی سینک ہے۔ محمود ذرا فاصلے
پر جا کر اس سے انگلیاں پوچھنا۔"

”جی ہر آئینہ نے کہا اور سفید پھولوں کے پاس
پہنچ گیا۔ اور پانچ انگلیاں اٹھا دیں :
”بتاؤ۔ کتنی انگلیاں نظر آ رہی ہیں تمہیں؟“
”تین۔“ اس نے فدا کہا۔

”ثابت ہو گیا۔ اس کی نظر بہت کمزور ہے۔
پانچ انگلیوں کی تین انگلیاں بتا رہا ہے۔ اور اگر اس
سیاہ پھول سے نظر کی خرابی دور ہوتی تو یہ ضرور
کب کا اسے چھوچکا ہوتا، کیونکہ یہ تو اس کے ملک
کا پھول ہے۔ اب میں اس کا ہاتھ پھول سے
مس کرنے چلا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھول کی طرف بڑھے۔
”نہیں۔ نہیں۔“ وہ پوری قوت سے چلا یا۔
اور خود کو ان کی گرفت سے پھڑانے کی بھرپور کوشش کرنے
لگا۔ لیکن وہ بھلا خود کو کہاں پھڑا سکتا تھا اور پھر
انیکٹر جمشید اسے پھول کے نزدیک لے گئے۔ اس کا ہاتھ
پھول کی طرف بڑھانے لگے، وہ پیچھے کی طرف زور لگا رہا تھا۔
اب اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”مجھ پر رحم کریں۔ میں مر جاؤں گا۔“
”تو اس پھول کو چھونے والا مر جاتا ہے؟“
”نہیں۔“

”اگر نہیں مرنے تو تم چھونے سے کیوں ڈر رہے ہو؟“
اور پھر انھوں نے اس کا ہاتھ پھول سے چھو دیا۔
اس کے منہ سے ایک بھیاںک چیخ نکل گئی۔ دوسروں کی
نظریں اس پر جم گئیں۔ انیکٹر جمشید اسے پھول سے
دور باقی لوگوں کے پاس لے آئے اور چھوڑ دیا۔ وہ
کھڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ اسے کچھ بھی نہ ہوا۔
”بس! آپ ایسے ہی تیس مارغان بن رہے تھے۔
کیا ہو گیا ہے مجھے۔ اس پھول کو چھو کر۔“
اب سب کی نظریں انیکٹر جمشید پر جم گئیں۔
”تمہارا خیال غلط نکلا جمشید۔ اس پھول میں خطرناک
بات کوئی بھی نہیں ہے۔“ صدر صاحب مکرانے۔
”ہو سکتا ہے سر۔ میرا خیال غلط ہو۔“ لیکن آپ خود
سوچیں، اگر اس پھول میں یا اس پودے میں ایسی کوئی
بات نہیں تھی۔ تو پھر یہ اس قدر خوف زدہ کیوں تھا؟
”میں ایکٹنگ کر رہا تھا۔“
”ہوں۔ آئیے۔ آگے چلیں۔“

ساتھ ہی انھوں نے دور کھڑے ایک سادہ لباس
والے کو اشارہ کیا۔ انھوں نے اندر جگہ جگہ سادہ لباس
والوں کی ڈیوٹیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ تیسر کی طرح ان

کی طرف آیا۔

"اس شخص پر نظر رکھو۔ اب یہ کیا کرتا ہے۔ کہاں جاتا ہے۔ اس کا نام کیا ہے۔" دیر پاؤں میں اس کا پتا کیا ہے۔ یہ وہاں نباتات کے ٹکے میں ملازم ہے یا نہیں۔ اور تمام معلومات مجھے جلد از جلد چاہئیں۔"

"اوکے سر۔ میں ابھی کام شروع کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور وہ آگے بڑھ گیا۔

"لیکن اب اس کی نگرانی کرانے کی کیا ضرورت ہے؟" صدر صاحب بولے۔

"میرے خیال میں ضرورت ہے سر۔ آپ چلیے۔" اس پھول کو چھونے کی حسرت ہی رہ گئی۔ میرے خیال میں اب تو میں اسے چھو سکتا ہوں۔

"جی نہیں۔ آپ اب بھی اس پودے کو نہیں چھو سکتے۔ کیونکہ کچھ زہر فوڈا اپنا اثر نہیں دکھاتے۔ کچھ دیر بعد بھی اثر دکھائے ہیں۔"

"لیکن میرا خیال ہے۔ یہ سب تمہارا وہم ہے۔"

"تب پھر وہ خوف زدہ کیوں تھا؟"

"اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ کسی اور مہمان نے صدر

صاحب کو کسی پھول یا پودے کو چھونے کے لیے نہیں کہا، اور ان کا ڈاؤنڈ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل کر ایوان صدر کی طرف روانہ ہونے لگے۔ ایسے میں انپکٹر جمشید بولے:

"اب میرا کام ختم ہو گیا ہے سر۔ میں یہیں سے اجازت چاہوں گا۔"

"گویا تم میرے ساتھ ایوان صدر نہیں جاؤ گے؟" نہیں سر۔ مجھے کچھ اور کام ہیں۔

"اچھی بات ہے۔ وہ بولے۔

ان کے جانے کے بعد انپکٹر جمشید پھر ناقص نگاہ میں داخل ہو گئے اور سیدھے اس سیاہ پھول والے مہمان کے پاس جا پہنچے۔ وہ گم سم سا کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر چونکا اور پھر سیدھا ہو گیا:

"آپ۔ اب کیا ہے؟ اس کا لہجہ بہت ناخوش گوار تھا۔"

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں سر۔ اوہ۔ آپ کا

نام تو میں جانتا ہی نہیں۔"

"میں ٹام روڈ ہوں۔"

"شکریہ سر ٹام روڈ۔ آپ یہاں کہاں ٹھہرے ہوئے

ہیں؟" انپکٹر جمشید بولے۔

"ہوٹل انٹرنیشنل میں۔ تمام مہمانوں کو وہیں ٹھہرایا گیا ہے۔"

"آپ کے کمرے کا نمبر؟"

"میں ۳۱۳ نمبر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کیوں کیا اب"

آپ وہاں بھی آئیں گے؟"

"ہاں آپ سے معافی مانگنے کے لیے آئیں گے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ اس نے برا سامنہ بنایا۔"

"لیکن ہم اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔"

"تو یہیں مانگ لیں۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں! ہم وہیں آئیں گے۔ آپ یہاں سے کب"

فارغ ہوں گے؟"

"رات نو بجے۔"

"تو ہم آپ سے رات سوا نو بجے وہیں ملاقات"

کریں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن میں اس کی ضرورت"

محسوس نہیں کرتا۔ اس نے کہا۔"

"ہم ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ انپکٹر جمشید سرد"

آواز میں بولے۔"

اور پھر وہ وہاں سے باہر نکل آئے۔ فون کر کے"

ایک ماتحت کے ذریعے اپنی کار وہاں منگوائی اور اس

میں بیٹھ کر ایک سمت میں رواں ہوئے۔"

"آج کی شکست ہمیں یاد رہے گی۔" فاروق بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔ صدر صاحب تو محفوظ رہے نا۔"

"ان کے لیے تو خیر نمائش گاہ میں کوئی خطرہ تھا ہی"

نہیں۔ ہمارے ایجنٹوں کی اطلاع غلط تھی۔"

"نوبت کے بعد ہم ایک بار پھر نمائش گاہ میں جاتیں"

گے۔ لیکن اس سے پہلے ہم ذرا ہوٹل انٹرنیشنل کے"

کمرہ نمبر ۳۱۳ کی تلاشی لے آئیں۔"

"اودہ۔ تو ابھی تک آپ کا شک رفع نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ اس سیاہ پھول میں ضرور کوئی"

خطرناک بات ہے۔"

"تب پھر تمام رُوڈ کو کیوں کچھ نہیں ہوا؟"

"اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے تلاشی۔"

اور پھر وہ ہوٹل انٹرنیشنل پہنچ گئے۔ کسی سے کوئی"

بات کیے بغیر وہ کمرہ نمبر ۳۱۳ کے سامنے پہنچ گئے۔"

حمود نے ماسٹر کی سے تالا کھولا اور وہ اندر داخل ہو"

گئے۔ اندر سے دروازہ انھوں نے بند کر لیا۔"

اب انھوں نے تلاشی شروع کی۔ اس کی ایک"

ایک چیز دیکھ ڈالی۔ لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے

ان کا شک پختہ ہو سکتا۔ آخر وہ وہاں سے نکل آئے۔
 نو بجے وہ نمائش گاہ پہنچے۔ اس وقت اندر داخلہ
 بند ہو چکا تھا اور لوگوں کو باہر نکل آنے کی ہدایات
 دی جا رہی تھیں۔ انپکٹر جمشید نے اپنا کارڈ دکھایا اور
 اندر داخل ہو گئے۔ وہ سیدھے اس سیاہ پھول والے
 پردے کے پاس پہنچے۔ ٹام روڈ اب وہاں نہیں تھا۔
 غالباً وہ اپنے ہوٹل جانے کے لیے وہاں سے روانہ ہو
 چکا تھا۔ انپکٹر جمشید نے ایک چٹنی کی مدد سے سیاہ
 پھول کو توڑ لیا اور پلاٹک بیگ میں رکھ لیا۔ بیگ
 جیب میں رکھ کر وہ باہر نکل آئے۔

اب وہ گھر پہنچے۔ گوشت کا ایک ٹکڑا لیا۔
 اسے درمیان سے چیرا، اس میں پھول کی ایک پنکھڑی
 رکھ دی، لیکن ساتھ لگاتے بغیر۔ اب انھوں نے گوشت
 کا وہ ٹکڑا اپنے کتے کو کھلا دیا۔ پانچ منٹ بعد کتا
 زور سے تڑپا اور مر گیا۔

"ارے باپ دے، محمود، فاروق اور فرزانه کی آنکھیں
 مارے خوف کے پھیل گئیں۔"

"اب کیا کہتے ہو؟"

"لیکن پھر ٹام روڈ کیوں نہیں مرا؟"

"اس لیے کہ ابھی اس نے پھول کو صرف چھوا ہے۔"
 "اگر چھو جانا خطرناک نہیں تو پھر وہ خوف زدہ کیوں تھا؟"
 "اس کا جواب میں ابھی دوں گا۔"

انھوں نے ایک کتے کو پکڑا۔ پھول کی ایک اور
 پنکھڑی کو چٹنی سے پکڑا اور اس پنکھڑی کو کتے کے پنجے
 سے بار بار چھونے لگے۔ ساتھ میں وہ گن بھی دہے
 تھے۔ ایک، دو، تین...

وہ گنتے چلے گئے۔ پھول کو مس کرتے چلے گئے۔
 آخر جب انھوں نے تیس مرتبہ چھو دیا۔ تو کتا بالکل
 اسی طرح زور سے تڑپا جس طرح پہلا کتا تڑپا تھا اور
 ساکت ہو گیا۔

"ارے باپ دے، محمود، فاروق اور فرزانه کے منہ
 سے نکلا۔"

"اب معلوم ہوا۔ ٹام روڈ کو کیوں کچھ نہیں ہوا۔"
 "لیکن وہ خوف زدہ کیوں تھا؟"

"اس لیے کہ اس کی موت اب تیس دن بعد ہو
 گی۔ انھوں نے کہا۔"

"تیس دن بعد۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے تیس مرتبہ پھول کو چھوا تو یہ کتا

جی مر گیا۔ ایک بار کے چھونے سے کچھ نہیں بنا تھا۔
لیکن پکھڑی کھلانے سے فوراً مر گیا۔ اب ٹام روڈ تیس

دن بعد مرے گا۔
"یہ بات آپ اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"
"اوہ جلیں۔"

انھوں نے پراسرار انداز میں کہا۔ محمود، فاروق اور
فرزاد کا مارے حیرت کے برا حال تھا۔

پھول کی موت

وہ ایک بار پھر ہوٹل انٹرنیشنل پہنچے۔ محمود نے
مکرمہ نمبر ۳۱۴ کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا
اور ٹام روڈ انھیں دیکھ کر چونکا:

"اوہ! تو آپ آگئے۔"

"ہم نے کہا تو تھا کہ آئیں گے۔"

"ہاں! آپ لوگوں نے کہا تھا۔ خیر آئیے۔ اب
کیا ہو گیا ہے؟"

"ہمیں صرف اتنا بتا دیں۔ آپ اس قدر خوف زدہ
کیوں تھے؟"

"میں آپ کو چڑا رہا تھا۔"

"کیوں! مجھے چڑانے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آ
گئی؟ وہ بولے۔"

"میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا،

میں نے سوچا۔ ذرا آپ کا ریکارڈ لگاؤں۔
 "اوہ! تو آپ اس لیے اس قدر خوف زدہ نظر
 آ رہے تھے؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"خیر۔ اب ذرا میری بھی بات سن لیں۔"

"فرمائیے۔ آپ کیا کنا چاہتے ہیں؟
 "نو بجے کے قریب، ہم نمائش گاہ پھر گئے تھے۔ اس
 وقت آپ وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔"

"اوہو اچھا۔ تو پھر؟ اس کے منہ سے نکلا۔"

"میں وہاں سے ایک سیاہ پھول توڑ لایا۔"

"کیا مطلب۔ آپ نے پھول کو ہاتھ سے توڑا؟ اس
 نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔"

"نہیں۔ چمٹی کے ذریعے۔ وہ مسکرائے۔"

"اوہ! اس کے منہ سے نکلا۔"

"گھر لے جا کر میں نے گوشت کے ایک ٹکڑے میں

ایک پنکھڑی رکھی اور اپنے ایک کتے کو کھلا دی۔"

"کیا! اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔"

"ہاں! کتا فوراً مر گیا۔"

"آٹ! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔"

"اس کے بعد میں نے ایک اور تجربہ کیا۔ ایک پنکھڑی
 کو چمٹی سے پکڑا اور اس کو ایک کتے کے پنجے سے مسلسل
 چھوٹا چلا گیا۔ تیس مرتبہ چھونے کے بعد وہ کتا بھی
 مر گیا۔"

"آٹ! وہ کانپ گیا۔"

"اب آپ کیا کہتے ہیں؟ انپکٹر جمشید بولے۔"

"میں۔ میں کیا کہوں؟ اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔"

"آپ یہاں سے اپنے ملک کب جا رہے ہیں؟"

"کل۔ اس نے بتایا۔"

"اس کا مطلب ہے، آپ وہاں جا کر اپنا علاج کرائیں"

گئے۔ آپ کو یہ اطمینان ہے کہ آپ کے پاس کافی وقت

ہے۔ آپ ابھی انیس دن اور زندہ رہیں گے۔"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اگر یقین نہیں تو میں پھول کی پتی آپ کے جسم سے

انیس مرتبہ مس کر دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ وہ پورے زور سے چلایا۔"

"تب پھر تم یہ بات مان لو۔ تم لوگوں کا پروگرام

ہمارے ملک کے صدر کو ہلاک کرنے کا تھا۔ تمہارے کئے

پر وہ پھول کو چھو لیتے اور تیس دن بعد مر جاتے۔"

"ہاں ایسی بات ہے۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔
 "شکریہ! آخر تم نے یہ بات مان لی۔ اب یہ بھی
 بتا دو۔ تمہارا ملک کیوں یہ چاہتا تھا، یعنی ہمارے
 ملک کے صدر کو ہلاک کرنا۔ وہ ہمارا دشمن ملک ضرور
 ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے صدر کی موت سے اس
 کے صدر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات تم مجھے
 بتاؤ گے۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو جانتے ہو۔ ہم کیا
 کریں گے؟

"لگ۔ کیا کریں گے؟
 "تمہیں تمہارے ملک نہیں جانے دیں گے۔ اس پھول
 کے زہر کے خلاف کوئی دوا تم نہیں کھا سکو گے۔ اس
 طرح تیس دن بعد تم مر جاؤ گے۔"
 "نہیں۔ وہ چلا یا۔"

"تب پھر ساری بات بتاؤ۔"
 "سچ یہ ہے کہ ساری بات مجھے ہرگز معلوم نہیں۔
 مجھے تو بس اتنی ہدایات تھیں کہ پھول کسی طرح صدر کے
 ہاتھ سے مس کر دینا ہے۔ اور بس۔ اس پھول کی
 خاصیت کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ میں اس
 میدان کا کھلاڑی ہوں۔ یعنی زہریلے پودوں کا۔"

"شکریہ! اب مشکل یہ ہے کہ تم ہمارے ملک کے
 صدر کو قتل کرنے آئے تھے، لہذا ہمارے قانون کے مطابق
 تم مجرم ہو۔ لہذا ہم تمہیں جیل بھیج رہے ہیں۔
 "آپ مجھے اپنے ملک جانے دیں۔"

"افسوس! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہاں، اگر تم ساری
 سازش کی تفصیلات بتا سکو تو شاید ہم نرمی کر سکیں۔"
 "اگر مجھے معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔"

"تب پھر جان سے جانا منظور کر لو۔ انہوں نے کہا،
 اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئے۔ اسے واقعی کچھ
 معلوم نہیں ہے۔ آخر چنڈ لٹے تک سوچنے کے بعد انہوں
 نے اکرام کو فون کیا۔

"اکرام واپس جلد ہی پہنچ گیا۔
 "اوہو! آپ نے ابھی تک اس کا پیچھا چھوڑا نہیں۔
 وہ چونکا۔

"تمہیں کس طرح معلوم ہو گیا؟ انہوں نے اسے گھورا۔
 "اس سادہ لباس والے سے آپ نے اس کے بارے
 میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایات دی ہیں۔"
 "ادھ اچھا خیر۔ اب اسے جیل بھجوانا ہے۔ جہاں
 یہ آئیس دن بعد مر جائے گا۔"

”جی۔ کیا مطلب؟“
انہوں نے اپنے تجربے سے لے کر یہاں ہونے والی باتوں تک سب اسے تفصیل سے سنا دیا:
”میں سمجھ گیا۔ چلو بھی چلیں۔“

”آپ میرے بارے میں ہمدردانہ غور کریں۔ اگر آپ مجھے دلیرانہ بھیج دیں گے تو میری جان بچ سکتی ہے۔“
”فکر نہ کرو، ہم یہ کوشش بھی ضرور کریں گے۔“
لیکن ان سے یہ پوچھیں گے۔ انہوں نے ہمارے صدر کے خلاف یہ سازش کیوں کی ہے، انہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ کوئی معقول بات بتا سکے تو اس صورت میں بھی ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ یا پھر ایک اور صورت ہے: انپیکٹر جمشید مسکراتے۔

”اور وہ کیا؟“
”تمہارے ملک والے اس پھول کے زہر کا علاج بتا دیں۔ لوہو۔ ارے۔“ انپیکٹر جمشید زور سے اچھلے۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

”کیا بات ہے آبا جان! خیر تو ہے؟“
”اس زہر کا علاج تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔“
”وہ کیسے؟ وہ ایک ساتھ بولے۔“

”اس پھول کی ہومیوپیتھک پونٹسی بنا کر۔“
”اوہ۔ اوہ۔“ ان سب کے منہ سے نکلا۔

”بہر حال ہم یہ تجربہ ضرور کریں گے۔ اگر اس کے ملک سے کوئی خاص دوا اس زہر کی آگئی تو وہ اسے استعمال کرا دیں گے۔ انہوں نے کہا۔“

”بہت بہت شکریہ۔ وہ دوا ضرور بھیجیں گے۔“
”ہم ابھی ان سے بات کرتے ہیں۔“

اکرام اسے لے کر چلا گیا۔ انپیکٹر جمشید نے ایوان صدر کا رخ کیا۔ صدر صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا:
”کیا رہا جمشید؟“

”میرا خیال سو فی صد درست نکلا۔ اگر آپ پھول کو چھو لیتے تو زندہ نہ بچتے۔“

”لیکن کیسے۔“ دلیرانہ کا وہ شخص پھر کیوں نہ مرا؟
”وہ انیس دن بعد مرے گا۔ اس پھول کو اگر کوئی صرف چھو لے تو تیس دن بعد مر جاتا ہے۔ میں نے اپنے دو کتے ضائع کیے ہیں، یہ بات جاننے کے لیے۔“
”کیا مطلب؟“ صدر صاحب حیران رہ گئے۔

انہوں نے انہیں بھی تفصیل سنا دی۔ صدر صاحب کتے میں آ گئے۔ رنگ سفید پڑ گیا۔

"اس کا مطلب ہے جمید۔ اگر تم مجھے نہ روکتے تو اس وقت تو کچھ نہ ہوتا اور تیس دن گزرتے ہی میں پٹ سے مر جاتا۔"

"ہاں! سر۔ یہی بات ہے۔"

"اُن جمید۔ اگر تم ساتھ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔"

"پھر بھی آپ بچ جاتے سر۔ اس لیے کہ آپ کی موت اس پھول کے ذریعے کبھی ہی نہیں تھی۔"

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"ہم ویریاں جا رہے ہیں۔ اس سازش کا پتا چلانے کے لیے وہاں جانا ضروری ہے۔"

"بھئی دیکھ لو۔ کہیں تم اپنی جان خطرے میں نہ ڈال لو۔ وہ دشمن ملک ہے۔"

"ان کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں بھی تو ہے سر۔"

"تو پھر۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"بس آپ دیکھتے جائیں۔ ابھی اس خبر کو دباتے رکھنا ہے۔ اخبارات میں بھی کوئی بات نہیں آئے گی۔ ٹام روڈ کی گرفتاری کے بارے میں فی الحال انہیں نہیں بتایا جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ جو جی میں آئے، کرو۔ انہوں نے

اجازت دی۔

انہوں نے فوری طور پر ویریاں جانے کے لیے کاغذات تیار کروائے۔ ایسے میں انہیں خان رحمان کا خیال آگیا: "میرا خیال ہے۔ انگل خان رحمان بھی ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

"چل سکنے کو تو پروفیسر داؤد بھی چل سکتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں کیوں پریشان کریں۔ یہ ہمارا کام ہے۔ اور ہم کر لیں گے۔"

"اگر وہ پریشانی محسوس کریں تب۔ لیکن اگر خوشی سے جانا چاہیں تو؟"

"اچھی بات ہے۔ پھر تم لوگ ہی پوچھ لو۔"

دوسرے دن وہ پروفیسر داؤد اور خان رحمان سمیت جہاز میں بیٹھے ویریاں کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے پاس بالکل درست اور مکمل کاغذات تھے۔ ایرپورٹ سے باہر نکلتے ہی انہیں گھیر لیا گیا۔ اگرچہ وہ ایرپورٹ کے اندر خطری پولیس کو اپنے تمام کاغذات دکھا چکے تھے اور انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

"یہ کیا ہے جناب؟ انیکٹر جمید بولے۔"

"آپ کو ہمارے ساتھ پہلے پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا،

اس کے بعد آپ ہمارے ملک میں گھوم پھر سکیں گے۔
 سیاحت کرنے کے لیے آتے ہیں آپ لوگ یہاں کی؟
 "ہاں ایسی بات ہے۔" انیکٹر جشید مسکراتے۔
 "شکریہ! چونکہ آپ لوگوں کا تعلق ہمارے دشمن ملک
 سے ہے، اس لیے چیکنگ ضروری ہے۔"
 "ضرور چیکنگ کر لیں۔"

"چیکنگ صرف اور صرف ہیڈ کوارٹر میں ہو سکے گی؟"
 "اچھی بات ہے۔ تو وہیں لے چلیں۔ اب آپ کے
 ہتھے چڑھ جو گئے ہیں۔" انیکٹر جشید مسکراتے۔
 انھیں پولیس ہیڈ کوارٹر لایا گیا۔ انھیں مختلف آلات سے
 چیک کیا گیا، تلاشی بھی لی گئی۔ لیکن ان کے پاس سے
 کوئی قابل اعتراض چیز نہ مل سکی۔

"آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ آپ یہاں تین دن کے لیے
 آئے ہیں۔ ٹھیک تین دن پہلے ہونے پر اپنی مقررہ پرواز
 پر آپ واپس چلے جائیں گے۔ اگر آپ اس جہاز سے
 واپس نہ گئے تو آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ پھر نہ
 کہیے گا۔ ہم نے آپ کو خبردار نہیں کیا۔"
 "اس بات کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں خبردار

کر دیا۔" فاروق نے مزہ بنایا۔

"ہمیں ایک کرائے کی کار چاہیے۔ آپ ایسی کسی ایجنسی
 کا نام بتاؤں فون نمبر دے سکتے ہیں۔"
 "ضرور کیوں نہیں۔" اس نے جیب میں سے ایک کارڈ
 نکال کر انھیں دے دیا۔

باہر نکل کر انھوں نے اس کارڈ کے نمبروں پر فون
 کیا، جلد ہی ایک کار وہاں پہنچ گئی۔ کار لانے والے
 نے ان سے تین دن کا ایڈوانس کرایہ وصول کیا اور وہاں
 سے رخصت ہو گیا۔ انھوں نے اس کے جانے کے بعد کار
 کو اچھی طرح چیک کیا۔

"مجھے اس کار سے خطرے کی بو آ رہی ہے۔"
 "ہاں! آؤ چلیں۔ اس کا بھی کچھ کرتے ہیں۔"

وہ وہاں سے سیدھے ساحل سمندر پہنچے۔ یہاں میر
 کے لیے آنے والوں کا اڈہ قائم تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا
 شہر ہی میر کرنے کے لیے آ گیا ہے۔

"تھوڑے فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کار موجود ہے،
 اس نے ہمارا یہاں تک تعاقب کیا ہے۔" فرزانہ بڑبڑاتی۔

"بس تو پھر۔ یہ لوگ ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔ اور
 آسانی سے ہماری دال نہیں گلے دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم گوشت گلا لیں گے۔" فاروق نے

منہ بنایا۔

"آؤ۔ ان میر کرنے والوں میں گھس مل جائیں۔
وہ اس کار سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ
اچانک ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔
"ہمیں شہر جانا ہے۔"
"ضرور لے چلوں گا۔ اس نے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھا
لے گیا۔

"کیا آپ ہمیں کالیں کرائے پر دینے والی کسی ایجنسی
کا پتا بتا سکتے ہیں؟
"پتا بتانا کیا ہوا۔ آپ کو وہاں تک لے جاتا ہوں۔"
"یہ اور اچھا رہے گا۔"

"ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں کاروں کی ایک ایجنسی کے
سامنے اتار دیا۔ وہاں سے انہوں نے ایک اور کار کرائے
پر لی۔ کرایہ ادا کیا اور پھر وہاں سے آگے بڑھے۔
ایک سادہ سے ہوٹل میں انہوں نے دو کمرے کرائے پر
لیے۔ یہاں بھی تین دن کا ایڈوانس کرایہ دینا پڑا۔
ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ فون
کی گھنٹی بجی۔ اور ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔
"جس ایجنسی کا پتا میں نے آپ لوگوں کو دیا تھا۔

اس کی کار آپ نے لے کر شامل پر چھوڑ دی۔ وہاں
سے ایک ٹیکسی لی۔ اور ایک اور ایجنسی کی کار کرائے پر
لی۔ اب آپ نے ہوٹل دینا میں دو کمرے کرائے پر
لیے ہیں۔ ان کے نمبر ۱۱۹ اور ۱۲۰ ہیں۔"
"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اس قدر چاق و چوبند
ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"ابھی آپ لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تین دن
تک آپ صرف حیران ہی ہوتے رہیں گے اور کچھ نہیں کر
سکیں گے، لہذا آپ کے لیے بہتر یہ رہے گا کہ... وہ
کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا بہتر رہے گا۔ آپ رک کیوں گئے؟
"کہ مجھے ساری بات سچ بتا دیں۔ پھر میں
دیکھوں گا کہ آپ لوگوں کے لیے کچھ کر سکتا ہوں یا
نہیں۔ وہ بولا۔

"ابھی بات ہے۔ آپ تشریف لے آئیں۔ انپکٹر
جینڈ نے مسکرا کر کہا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ میں صرف ساڑھے تین منٹ
بعد آپ کے کمرے کے دروازے پر دستک دوں گا۔
ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈرائیور دکھ دیا گیا۔

”اب کیا کریں۔ یہ حضرت تو ہماری ہر حرکت سے واقف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔“ محمود نے گہرا کر کہا۔
 ”پریشان ہونے اور گھبرانے سے کچھ نہیں بنے گا۔ ہم ان کے ملک میں ہیں۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل ہیں۔ جب کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنی کار تک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، کاریں کرائے پر دینے والی ہر انجینی کو پہلے ہی یہ ہدایت ہوں کہ اگر کوئی غیر ملکی پارٹی کار کرائے پر لے تو فوری طور پر اس پولیس آفیسر کو اطلاع دی جائے اور ساتھ میں ان کا تعاقب بھی کیا جائے۔“

”ہمارے پاس اب دو منٹ ہیں۔ کیا ہم ان دو منٹوں میں یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“
 ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہماری نگرانی تو بدستور ہو رہی ہے۔“

”ہوں۔ خیر۔ دیکھا جائے گا۔“ خان رحمان نے کندھے اچکاتے۔

ٹھیک ساڑھے تین منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھولنے پر وہی پولیس آفیسر نظر آیا۔
 ”آئیے جناب! مان گئے ہم تو آپ کی قابلیت کو۔“

”ابھی اور مانیں گے۔ وہ مسکرایا۔“

”اگر ماننے والی اور باتیں سامنے آئیں تو ہم ضرور آپ کو اور بھی مانیں گے۔ ہم ماننے کے سلسلے میں ذرا بھی کنجوس واقع نہیں ہوئے۔ فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔“

پولیس آفیسر اسے گھور کر رہ گیا، پھر بولا:

”اس کا مطلب ہے۔ آپ لوگ میرا مذاق اڑانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا یہ بیٹا ذرا شوخ واقع ہوا ہے۔“ انپکٹر جمشید مسکراتے۔

”اچھا خیر۔ اب ذرا تعارف ہو جائے۔ میں انپکٹر جم ہوں۔“

”میں جمشید احمد ہوں۔ یہ پروفیسر داؤد احمد، خان رحمان، محمود، فاروق اور فرزاد ہیں۔ انپکٹر جمشید نے بھی تعارف کرایا۔“

”آپ نے تعارف ذرا نامکمل کرایا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ انپکٹر بھی لگائیے نا۔“

”اوہو اچھا۔ تو آپ کو یہ بھی معلوم ہے۔ ان کے لمبے میں حیرت تھی۔“

”آپ یہ پوچھیے۔ مجھے کیا معلوم نہیں ہے۔“

" چلیے پھر یہی بتا دیں۔ فاروق وہ نہ سکا۔

" کیا بتا دوں؟ وہ جلدی سے بولا۔

" یہ کر آپ کو کیا معلوم نہیں ہے؟ فاروق نے کہا۔

" آپ نے اپنے بیٹے کی تعریف درست ہی کی تھی،

یہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شوخ ہیں۔ خیر میں کڑا

تھا۔ میں ابھی آپ کو اور حیران کروں گا۔ آپ ذرا

سج سج بتا دیں۔ یہاں کس لیے آئے ہیں؟

" اگر آپ کے خیال میں ہم سیاحت کے لیے نہیں

آئے تو آپ بتا دیں۔ ہم یہاں کس لیے آئے ہیں؟

" میں تو خیر بتا ہی دوں گا، لیکن پہلے میں آپ

لوگوں کے منہ سے سُنا چاہتا ہوں۔

" سو دی! آپ کو چاہیے۔ خود بتائیں۔" انیکٹر جمشید

نے منہ بنایا۔

" اگر میں چاہوں تو آپ لوگوں کو اسی وقت گرفتار

کر سکتا ہوں۔

" لیکن کس جرم میں؟

" جرم میں یہاں نہیں، عدالت میں بتاؤں گا۔

" تو کیا اس ملک میں جرم بتاتے بغیر لوگوں کو گرفتار

کیا جاتا ہے؟

" ہاں! بالکل کیا جاتا ہے۔ جرم بعد میں بتاتے رہتے

ہیں۔ وہ ہنسنا۔

" تو پھر آپ ہمیں بھی گرفتار کر لیں۔ تاکہ ہمیں اپنے

جرم کا پتا تو چل جائے۔

" وہ میں آپ لوگوں کو گرفتار کیسے بغیر ہی بتا دوں

گا۔ میں تو یہ بتا رہا تھا کہ آپ لوگ اس خوش فہمی

میں نہ رہیے گا کہ آپ کے پاس پورے کا فذا

ہیں اور آپ کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں صرف اور

صرف ہمارا قانون چلتا ہے۔ کیا سمجھ؟

" سمجھ گیا۔ یہاں صرف اور صرف آپ کا قانون چلتا

ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کو بین الاقوامی قوانین کی کوئی پروا

نہیں ہے۔

" ہاں! نہیں ہے۔ اب سنیں۔ آپ نے کیا کیا ہے۔

آپ کے ملک میں چھوٹوں کی نمائش تھی۔ آپ کے ملک

کے صدر کو اس نمائش کا افتتاح کرنا تھا۔ صدر صاحب

نے آپ لوگوں کو ساتھ لیا، کیونکہ انھیں اطلاع مل چکی

تھی کہ انھیں اس نمائش کے دوران ہلاک کر دیا جائے

گا، لہذا آپ کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ اس میں

شک نہیں کہ آپ نے اپنے ملک کے صدر کو پھول کی موت

سے بچا لیا۔ لیکن ہم بھی ناکام نہیں رہے۔

”کیا مطلب؟ انپکٹر جمشید زور سے چونکے۔

”یہ بات آپ کو میں بتاؤں گا انپکٹر جمشید۔“

اسی وقت ایک آواز ابھری۔ بغلی دروازہ کھلا اور

اندر سے ایک لمبے قد کا آدمی کمرے میں آگیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

راہل

انہوں نے دیکھا، وہ راہل تھا۔ حالانکہ دلدل والی مہم کے بعد وہ اسے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنے ملک لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہاں انہیں پہلے شکنجوں میں کسا گیا تھا۔ تاکہ اخلاق اور دوسروں کا انتقام لیا جائے۔ اور پھر انہیں ایک سپیشل جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں یہ اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ لیکن اب راہل کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی جو حالت ہوئی وہ ہونی ہی تھی۔

”مجھے یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے نا؟“

”اب حیرت بے چاری بھی کیا کرے؟“ فاروق نے برا سامنے بنایا۔

”خوب جی بھر کر حیران ہو لو۔ ہمیں کوئی اعتراض

نہیں ہے۔" رابل ہنسا۔

"آپ ہماری جیل سے کب فرار ہوتے؟"

"ہم تو وہاں زیادہ سے زیادہ ایک دن رہے ہوں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں آج تک اس بات کی

اطلاع کیوں نہیں ملی؟"

"اس لیے کہ آپ کے ملک کے لوگ بہت آسانی

سے خریدے جاسکتے ہیں۔"

"لیکن کوئی جیلر بھی اتنا بڑا جرم نہیں کر سکتا۔ آخر

طلب کرنے پر وہ یہ تین قیدی کہاں سے پیش کرے گا؟

وہیں سے۔ جیل میں ہمارے تین ہم شکل اسے

بدلے میں دیے گئے تھے۔ تبھی تو وہ یہ سودا کرنے

پر تیار ہوا تھا۔"

"اوہ! اور تین ہم شکل کہاں سے لیے گئے؟"

"ہمارے ملک میں اس قسم کے لوگ بہت مل جاتے

ہیں۔ پھانسی کی سزا کے تین مجرموں کو ایک آپ میں

آپ کے ملک کی اس جیل تک پہنچا دیا گیا۔ اور انھیں

ساری بات بتا دی گئی۔ وہ پھانسی سے پنج رہے تھے،

انھیں اور کیا چاہیے تھا۔"

"یہ بات سن کر حیرت ہوئی۔ خیر۔ آگے چلیے۔ یہ

تو معلوم ہو گیا کہ اب آپ تینوں ہمارے ملک کی جیل

میں نہیں ہیں۔ اس جیلر سے تو ہم نمٹ ہی لیں گے۔"

"اگر اس بات کا کوئی امکان ہوتا تو میں یہ بات

آپ لوگوں کو ہرگز نہ بتاتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ یہ کہ سیاہ پھول

کے ذریعے تمہارے ملک کے صدر کو ہلاک کر دیا جائے۔

ساتھ ہی میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہو سکتا ہے۔

انیکٹر جمشید یا انیکٹر کامران مڑا سیاہ پھول سے اپنے صدر کو

پچا لیں۔ اس صورت میں وہ اس ملک ضرور آئیں گے

تاکہ یہ جان سکیں کہ ان کے خلاف یہ سازش کی کس

نے تھی۔ لہذا میں آپ لوگوں کے سامنے ہوں۔ یہ

سازش میں نے تیار کی تھی۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا

کہ آپ لوگ ہماری نظروں سے پنج کر یہاں آجائیں،

اگرچہ آپ لوگوں نے چھپ کر آنے کی کوشش بھی نہیں

کی۔ اگر کرتے تو بھی کامیاب نہ ہو پاتے۔ اس لیے

کہ سازش کے پیچھے میرا ہاتھ تھا۔ اور یہ بات آپ

لوگ مانتے ہیں۔ میں منصوبہ ساز کہلاتا ہوں۔"

"یہ بات تو خیر ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

”لہذا اس شہر میں آپ ہماری نظروں سے بچ کر کہیں بھی نہیں جا سکتے تھے۔“

”چلیے۔ مان یا۔ آگے منصوبہ کیا تھا۔ یہ کہ اگر صدر صاحب بچا لیے گئے تو ہم یہاں آئیں گے۔ اس کے بعد؟“

”اس کے بعد ہم اپنے منصوبے کو آخری شکل دیں گے۔“
”میں آپ کے میک آپ میں آپ کے ملک جاؤں گا، میرے ساتھ پروفیسر داؤد، خان رحمان، محمود، فادوق اور فرزاد بھی ہوں گے۔“

”کیا مطلب؟ وہ ایک ساتھ بولے۔“

”آپ لوگ تو ابھی سے اچھل پڑے۔ ابھی تو اچھلنے کے مقامات اور بہت آئیں گے۔ ذرا یہ اچھل کود بچا کر رکھیں۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔“

ان کے دماغ سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ دابل کو اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ اس دنیا کی نہیں کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ آخر دابل کے بند ہونٹ ہلے۔
”اور پھر میں تمہارے ملک کے صدر کو نہایت آسانی سے اس پھول کی موت مار کر آؤں گا۔ اپنے دستانوں والے ہاتھ میں پھول کی ایک پگھڑی پکڑے جب

میں صدر سے ہاتھ ملاؤں گا تو اس کے تیس دن بعد صدر صاحب خاموشی سے موت کی نیند سو جائیں گے اور کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا کہ کیا ہوا ہے۔ سب اس کو قدرتی موت خیال کریں گے۔“

”اوہ اہم۔ اہم کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھیں رہیں گے؟ خان رحمان نے جھٹکا کر کہا۔“

”آپ یہاں سہماں رہیں گے۔ جب میں اپنا کام کروں گا تو انشاذج اپنی پسند کا صدر آپ کے ملک میں لے آئے گا اور اس وقت ہم تمام روڈ کو آپ لوگوں کے بدلے میں وصول کر لیں گے۔ لہذا منصوبہ اس طرح بھی مکمل ہو جائے گا۔ اگر صدر صاحب تمام روڈ کے ذریعے پھول کی موت نہیں مر سکے تو کیا ہوا۔“

”اوہ۔ تو یہ سب کچھ انشاذج کے اشارے پر ہو رہا ہے۔“
”ہاں! آپ کے ملک کا موجودہ صدر اسلام کا کچھ زیادہ ہی شیدائی ہے۔ وہ ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنے پر تیار ہوا ہے۔ انشاذج جھلا یہ بات کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔ وہ تو اسلام دشمن صدر یا وزیر اعظم پسند کرتا ہے۔ لہذا آئینہ الیکشن میں اسلام دشمن آدمی آپ کے ملک کا سربراہ بن جائے گا اور میرا منصوبہ کامیاب۔“

اس نے جلدی جلدی کہا۔

ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے اپنے ذہن دوڑانے لگے۔

اب آپ لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہاں سے کس طرح نکل بھاگیں اور اپنے ملک پہنچ جائیں۔ تاکہ ہم اس منصوبے پر عمل نہ کر سکیں۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں۔ یہ ہوٹل اس وقت پوری طرح ملٹری کے گھیرے میں ہے۔ اور آپ کسی صورت بھی فرار نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ کہ اگر کسی طرح یہاں سے آپ نکل بھی بھاگیں۔ تو آپ کو ہر قدم پر رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ پہلے ہی ہر امکان پر غور کر لیا گیا۔ ملک سے باہر جانے والا ہر راستا بند ملے گا۔ اور آپ پرندوں کی طرح پھڑپھڑا کر رہ جائیں گے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے بلند آواز میں کہا:

"کمرے میں آ جائیں۔"

دروازہ کھلا اور ملٹری کے کچھ آفیسر اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید طرز کے پستول تھے۔ انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔

"انہیں پیش دسی سے باندھ دیا جائے۔ اس ملاکے

کے جوتے کی ایڑی میں سے ایک چاقو نکال لیا جائے۔ باقی سامان بھی ان کی جیبوں سے نکال لیا جائے۔ حوالات میں ان کے پاس کوئی چیز بھی نہیں ہونی چاہیے، یہ بے کار سے بے کار چیز سے کام چلا لیتے ہیں۔ اس نے جلدی جلدی ہدایات دیں۔ اور وہ مسکرا کر رہ گئے۔ گویا رابل کو ان کے بارے میں ہر بات معلوم تھی۔

انہیں باندھا جانے لگا۔

"اس دسی کو آپ لوگ توڑ نہیں سکیں گے۔ کاٹنے کی کوئی چیز آپ کے پاس آنے نہیں دی جائے گی، جب تک میں خود پاس نہیں ہوں گا۔ کسی ضرورت کے لیے آپ کو کھولا نہیں جائے گا۔"

"کچھ بھی کر لیں مسٹر رابل۔ آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

"بہت جلد آپ لوگ دیکھیں گے۔ کہ ہم کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔"

ان سب کو اچھی طرح جکڑ دیا گیا۔ اور پھر وہاں سے ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ جلد ہی وہاں رابل اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگ پہنچ گئے۔ ان

میں دو لڑکے اور ایک لڑکی بھی تھے۔ وہ سمجھ گئے۔
ان پر ان کے میک آپ کیے جانے تھے۔ خان رحمان
کی جہانت کا ایک آدمی بھی ان میں تھا۔ اور پروفیسر
داؤد کے قد و قامت کا بھی۔ خود رابل تو پہلے ہی انپکٹر
جمشید کے قد و قامت کا تھا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں انپکٹر جمشید۔ ہم نے کتنے مناسب
ساتھی تلاش کر لیے ہیں۔"
لیکن مسٹر رابل۔ یہ میرے بچوں کی طرح چمکیں گے
کس طرح؟

"پہلے ذرا میک آپ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ ان
کا چمکنا بھی دیکھیں گے۔" رابل پُر اسرار انداز میں مسکرایا۔
"خیر یونہی سہی۔ انپکٹر جمشید نے کدھے اچکائے۔

اور پھر میک آپ کے چادر ماہرین ان لوگوں کے
پہروں پر کام کرنے لگے۔ جنھیں وہاں لایا گیا تھا۔ رابل
کے چہرے پر انپکٹر جمشید کا میک آپ کیا گیا۔ اس
کام میں کتنی گھنٹے لگ گئے۔ اور جب کام مکمل ہوا تو
وہاں دو انپکٹر جمشید، دو خان رحمان، دو پروفیسر داؤد اور
تینوں بچے بھی دو دو نظر آ رہے تھے۔ اور اگر ایسے میں
کوئی اندر آ جاتا تو حیرت زدہ رہ جاتا اور یہ فیصلہ ہرگز

ذکر پاتا کہ ان میں اصلی کون ہیں اور نقلی کون۔
"اور اب ذرا ہم ان لوگوں کو بات چیت کر کے دکھاتیں۔"
رابل نے انپکٹر جمشید کی آواز میں کہا۔
"ضرور کیوں نہیں آتا جان۔" محمود کے میک آپ دالا لڑکا
بالکل اس کی آواز میں بولا۔

اور وہ دھک سے رہ گئے۔ ان کی آواز میں اور ان
آوازوں میں کوئی فرق نہیں تھا، پھر انھوں نے آپس میں
بات چیت شروع کی۔ تو ان کی حیرت اور بڑھ گئی۔
اس لیے کہ وہ بالکل ان کے انداز میں چمک رہے تھے؛
"مان گئے بھئی۔ تم لوگوں کو مان گئے۔" انپکٹر جمشید نے
مسکرا کر کہا۔

"اب کیا خیال ہے۔ ہم کامیاب ہوں گے یا نہیں؟" رابل
نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن۔ آپ لوگوں کی کامیابی
کے زبردست امکانات ہیں۔ مہربانی فرما کر اپنے پروگرام
کو یہیں ختم کر دیں۔ ہمیں ابھی اپنے ملک کے صدر کی
بہت ضرورت ہے۔ وہ بہت اچھے اچھے کام کر
رہے ہیں۔"

"یہی تو دونا ہے۔ اگر وہ اسلام کی جڑیں کاٹنے

والا ہوتا تو ہم اس کی طرف دیکھتے تک نہ۔ بلکہ اٹا
اس کی کمر پر تھپکی دیتے۔ شاباش دیتے۔ لیکن یہ موجودہ
صدر ہماری مرضی کے بالکل خلاف ہے، لہذا اس کا کاشا
تو نکال ہی پڑے گا۔

”اللہ اپنا رحم فرمائے۔“

”اب آپ لوگ اس عمارت میں آرام کریں۔ ہم نے
آپ کو عام حوالات کی بجائے یہاں رکھنے کا فیصلہ
کیا ہے۔ امید ہے، یہ قید خانہ آپ کو زیادہ ناگوار نہیں
گزرے گا۔ انھیں اب دسیوں سے آزاد کر دو۔“

راہل اور اس کے ساتھی عمارت سے نکل گئے۔

عمارت کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اور اب صرف
وہ عمارت میں رہ گئے۔ اب وہ دسیوں سے آزاد تھے:

”یہ تو بُرا ہوا خانہ رحمان۔“

”ہم نے سوچا تھا کیا اور ہو گیا۔“

”یہ راہل کا جو ذہن ہے۔ شیطانی ذہن ہے۔“

عجیب و غریب منصوبے اس کے دماغ میں سے نکلتے ہیں،
اتھ پیس کی بجائے یہ عقل سے زیادہ لڑتا ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ ہمارے پاس
تو اب محمود کا چاقو بھی نہیں رہا۔ آخر ہم اس عمارت

سے کس طرح نکلیں گے۔ اور وہ پہلی فرصت میں ہمارے
ملک کی طرف روانہ ہو جائیں گے اور صدر صاحب کے
جسم سے سیاہ پھول مس کر دیں گے۔ اس کے تیس
دن بعد تک وہ بالکل درست حالت میں زندہ رہیں گے،
اس کے بعد اچانک مر جائیں گے اور کوئی ان کی موت
کا سبب تک نہیں جان سکے گا۔ لیکن ہمیں اس سے
پہلے پہلے کچھ کرنا ہو گا۔ ہاں۔“

”جب تک ہم اس عمارت سے نہیں نکل جاتے۔
اس وقت تک بھلا کیا کر سکتے ہیں۔“

”پہلے ہمیں اس عمارت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ اسی
صورت میں ہم کچھ کر سکتے ہیں۔“

انھوں نے پوری عمارت کا جائزہ لیا۔ باہر نکلنے
کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زینے کا دروازہ بھی چھت کی طرف
سے بند تھا۔ محمود کا چاقو اگر ان کے پاس ہوتا تو
وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر گزرتے۔ لیکن اب موت اور
زندگی کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔

انھوں نے بار بار مکان کا اچھی طرح جائزہ لیا۔
لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

”اب تو رات کا کھانا لانے والوں کا انتظار کرنا

پڑے گا۔ شاید اس وقت ہمیں کوئی موقع مل سکے۔
 انیکٹر جمیڈ نے کہا۔

اور پھر رات ہو گئی اور وہ کھانا لانے والوں کا
 انتظار کرنے لگے۔
 آخر کار قدموں کی آواز سنائی دی۔

مقامی آدمی

پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور کسی نے بلند آواز
 میں کہا:

”دروازے کے نیچے سے کھانا سرکایا جا رہا ہے۔
 اٹھا کر کھا لو۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازے کے نیچے سے
 کھانے کی ٹرے اندر آنے لگی۔ انھوں نے ٹرے کی
 طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اگرچہ انھیں بھوک لگ
 رہی تھی۔ لیکن وہ ٹرے میں سے کچھ بھی نہیں کھا
 سکتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد پھر دروازے پر آہٹ ہوئی
 اور اسی شخص نے کہا:

”کھانے کی ٹرے باہر سرکا۔۔۔ اسے یہ ٹرے تو
 بالکل وہیں موجود ہے۔ جہاں تک ہم نے اندر سرکا
 دی تھی۔“

اور پھر ٹرے باہر کھینچ لی گئی۔
 "کمال ہے۔ اس میں تو کھانا مجھوں کا توں موجود ہے۔ کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"
 "حیرت ہے۔ ان لوگوں نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ جب کہ ہمارے خیال میں یہ بہت بھوکے ہیں۔"
 "میں دیکھتا ہوں۔"

اور پھر دروازے پر زور زور سے دستک دی جانے لگی، وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔
 "کیا ان لوگوں نے خودکشی کر لی؟"
 "کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا انھیں خودکشی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس عمارت میں تو بڑے بڑوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔"
 "لیکن ہمیں عمارت کھولنے کا حکم نہیں ہے۔"
 "خیر۔ کل صبح ہم پھر ٹرے اندر سرکائیں گے۔ اور دیکھیں گے۔ وہ ٹرے اندر کھینچتے ہیں یا نہیں۔"
 "ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

"دوسری صبح تک انھوں نے عمارت میں کوئی آواز نہ سنی۔ تاہم انھوں نے ناشتے کی ٹرے اندر سرکا دی اور دروازہ بھی زور زور سے دھڑ دھڑا دیا۔ آواز بھی

لگا دی کہ ناشتا کر لیں۔ لیکن اندر کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ نہ ٹرے کھینچی گئی۔ بس بار وہ ٹرے کے پاس سے ہٹ بھی نہ سکے۔

"نہیں بھئی۔ وہ زندہ نہیں ہیں۔ آخر وہ کیوں اتنی دیر تک بھوکے رہیں گے۔"

"تاکہ ہم یہ سوچ کر دروازہ کھول دیں کہ یہ لوگ مر چکے ہیں اور اس وقت وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"
 "دماغ تو نہیں چل گیا۔ پورے ایک دن کے بھوکے پیاسے بھلا کسی پر کیا ٹوٹ سکیں گے۔"
 "بہر حال ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

"لیکن۔ ہم سے یہ کب کہا گیا تھا کہ اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آ جائے تو تب بھی دروازہ نہ کھولنا۔"
 "دوسرا بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پھر بھی دروازہ نہیں کھولیں گے۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"لیکن ان کی تو اندر سڑ جاتیں گی لاشیں۔"
 "تو سڑ جاتیں۔ ہمیں ان کی لاشوں کا اچھا تو نہیں ڈان۔"
 "ہمارے پاس بھتیار ہیں۔ ان کی موجودگی میں اگر ہم کھول کر دیکھ لیتے تو کیا حرج تھا۔ یہ بھوکے پیاسے

لوگ بھلا کیا کر لیں گے۔

"یہ بھی تو سوچو۔ اس عمارت میں بہت اہم لوگ رکھے جاتے ہیں۔ جو کسی طرح بھی فرار نہ ہو سکیں۔ ان کے فرار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ تبھی مسٹر رابرٹ نے ہمیں اس قدر سخت ہدایات دی تھیں۔ انھوں نے کہا تھا۔ چاہے کچھ ہو جائے، ہم دروازہ نہ کھولیں۔"

"اچھی بات ہے۔ نہیں کھولتے دروازہ۔ لیکن ہم کھانے کی ٹرے ضرور رکھتے رہیں گے۔"

"ہاں! وہ تو ہے۔"

دوپہر کو انھوں نے پھر کھانے کی ٹرے اندر سرکا دی۔ ناشتے کی ٹرے جوں کی توں رکھی ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے کی ٹرے کو بھی نہ چھوا گیا۔ اب تو انگریزوں کے چہروں پر حیرت اور خوف دوڑ گئے۔

"نہیں بھئی۔ اب وہ زندہ نہیں ہیں۔"

"ہاں! میرا دل بھی یہی کہنے لگا ہے۔ اب تک جو دروازہ کھولنے کی مخالفت کرتا رہا تھا، اس نے کہا۔"

"لیکن اندر سے بو نہیں آتی۔ ایک اور بولا۔"

"سردی کا موسم ہے۔ لاشیں دیر سے سڑتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے۔ کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ ہمارے"

پاس کلاشن کوفیں موجود ہیں۔"

"میں کتا ہوں۔ ابھی ایک وقت اور دیکھ لیں۔"

اگر انھوں نے شام کے کھانے کی ٹرے بھی اندر نہ سرکائی تو پھر کھول لیں گے۔

"چلو یونہی سہی۔ اگرچہ یہ وقت گزارنا کافی مشکل کام ہو گا۔"

"اب یہ اتنا زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ تاش کھیل کر گزار دیں گے۔"

جیسے تیسے کر کے انھوں نے شام کا وقت گزارا۔ اور پھر ٹرے اندر سرکا دی، لیکن ٹرے میں حرکت نہ ہوئی۔

"پورے دو دن ہو گئے۔ دو دن تک کوئی کھانے پیے بغیر رہ سکتا ہے۔ جب کہ کھانا پاس موجود ہو۔"

"نہیں۔ اور پھر ان میں ایک بوڑھا آدمی اور تین بچے بھی ہیں۔ بوڑھے اور بچے تو بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔ نوجوان تو چلو پھر برداشت کر لیتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ کلاشن کوفیں تیار رکھو۔"

"نکد نہ کرو۔ اگر انھوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو ہم فائر کھول دیں گے۔"

"اور مسٹر رابل کو کیا جواب دیں گے؟"
 "ان کی موت کا مسٹر رابل کو کوئی افسوس نہیں ہو
 گا۔ ہاں اگر وہ یہاں سے فرار ہو گئے تو اس صورت
 میں ان کا غصہ آسمان سے باتیں کرے گا۔"
 "اور یہ فرار ہو کیسے کیسے گئے۔ دو دن کے بھوکے
 اور پیاسے لوگ نہ تو بھاگنے کے قابل ہوتے ہیں، نہ
 لڑنے کے۔"
 "اچھا کھولو۔ باتیں ختم۔"

دروازے کا تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔
 وہ نکل پانچ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں
 تھیں۔ باقی پہرے دار عمارت کے چاروں طرف تھے۔
 انھیں ان باتوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ ان لوگوں
 نے انھیں یہ بتایا تھا کہ وہ دروازہ کھول رہے ہیں،
 باقی لوگ ذرا ہوشیار رہیں۔
 انھیں اندر وہ نظر نہ آئے۔

"شاید یہ لوگ کمروں کے اندر ہی پڑے رہ گئے۔
 باہر بھی نہیں نکل سکے۔ ایک نے افسوس زدہ انداز میں کہا۔
 وہ اور آگے بڑھے اور ایک کمرے میں داخل ہو
 گئے۔ لیکن یہ بھی خالی تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور

کمرہ تھا۔ وہ اس میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا۔
 "ہائیں۔ آخر یہ لوگ کہاں ہیں؟"
 "اؤ۔ باقی جگہیں بھی دیکھ لیں۔ کیسے وہ کسی راستے
 سے فرار نہ ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں مسٹر رابل ہمارے
 لیے ایک مصیبت ثابت ہوں گے۔"
 "لیکن وہ فرار کس طرف سے ہو سکتے ہیں۔ اس عمارت
 میں کوئی ایسا خفیہ راستہ ہی نہیں ہے۔"

انھوں نے پلوری عمارت کو اچھی طرح دیکھ ڈالا۔
 ان کا کہیں پتا نہ چلا۔ اب تو ان کے ہاتھ پیر پھول
 گئے۔ وہ باہر کی طرف دوڑے۔ اور پیچھے چلتے
 باہر نکل آئے۔ ملٹری مین ان کی طرف دوڑے،
 "کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟"

"وہ۔ وہ عمارت میں نہیں ہیں۔ فرار ہو گئے۔"
 "کیا کہا۔ فرار ہو گئے۔ لیکن نہیں۔ ہم نے کسی
 کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک ملٹری آفیسر نے کہا۔
 آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ کسی نہ کسی طرح
 نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اندر وہ
 نہیں ہیں۔"

"یقین نہیں آ رہا۔"

یہ کہ کو مٹری میں بھی اندر گھس گئے۔ انھوں نے بھی چپے چپے چھان مارا۔ اور پھر سب نے ادھر ادھر دوڑ لگا دی۔ مٹری کی جیپیں بے تحاشہ حرکت میں آ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہو گیا۔ وہاں نہ تو وہ پانچ نگران ٹھہرے۔ نہ باہر والے مٹری میں۔ ایسے میں عمارت میں ایک آواز ابھری:

"میدان صاف ہو گیا۔ اب ہم باہر نکل سکتے ہیں۔" لیکن میں کچھ کھاؤں گا۔ آف مالک! اس قدر خونگ مہیبت میں نے زندگی میں پہلی بار جھیلی ہے۔ کھانے کی ٹرے سامنے رہی اور میں اس میں سے ایک لقمہ نہ لے سکا۔ پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔ "بالکل ٹھیک۔ پہلے ہم کچھ کھائیں گے۔ ان لوگوں کے اس طرف جلد واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انیسٹر جمیڈ بولے۔

وہ بادوچی خانے میں گھس گئے۔ اور جو ہاتھ لگا کھاتے چلے گئے۔ خوب اچھی طرح پیٹ بھرنے کے بعد انھوں نے باہر کا رخ کیا:

"یہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے۔ پھینے کی جگہ ہم نے کیا تلاش کی۔ جہاں ان کا خیال تک نہ جا سکے۔ محمود

نے سکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن آئٹن دان کی چینی میں ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہونا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ہم تو پھر اوپر تھے، لیکن آبا جان اور انکل خان رحمان نیچے تھے۔ ذرا سوچو ان پر کیا ہوتی ہوگی۔"

"ہماری فکر نہ کرو۔ اور پھر ایسا ہمیں صرف پندرہ منٹ کے لیے کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ۔ بعد مٹری میں بھی عمارت کی تلاشی لے کر باہر جا چکے تھے۔"

"خیر۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم کس طرف کا رخ کریں، اس وقت تک ہر طرف ہماری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ہمیں کسی گھر میں پناہ لینا ہوگی۔ کیونکہ اپنے ملک کا رخ کرنے سے ہمارے لیے یہ کہیں زیادہ ضروری ہے کہ ہم صدر مملکت کو فون کر دیں۔ کیا خیال ہے۔ ابھی تک صدر صاحب سے ان لوگوں کی ملاقات تو نہیں ہوئی ہوگی۔"

"اللہ نہ کرے۔ انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

رات کا وقت تھا۔ مٹرکین سنان تھیں۔ کسی وقت کوئی گاڑی مٹرک سے گزر جاتی۔ آخر انھوں نے مٹرک چھوڑ دی۔ اور ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ پھر

ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ اور ایک نوجوان آدمی نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں سوال لہرائے :

”فرمائیے۔ آپ کون لوگ ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں؟“

”آپ کے گھر سے ایک فون...“

”اوہ! کہیں آپ وہی قیدی تو نہیں ہیں۔ جو پشیل جیل سے بھاگ نکلے ہیں؟“

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کر دینا چاہا، لیکن اس سے بھی پہلے انیکٹر جمشید اپنا جوتا دروازے میں اڑا چکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے اسے ایک دھکا دیا اور اندر داخل ہو گئے۔ وہ اندر کی طرف دوڑ پڑا۔

”کیا ہوا رومیو؟“ اندر سے کسی عورت نے چلا کر کہا۔

لیکن رومیو پر تو انیکٹر جمشید پھلانگ لگا چکے تھے اور اس کا مٹا دبوچ چکے تھے :

”مسٹر رومیو۔ اب مزے سے آواز نہ نکالنا۔ ورنہ گلا دبا دوں گا۔“

میں اس وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پھر ایک عورت کی پیچ لہرائی۔ وہ جھوم کر گرنے لگی، لیکن

خان رحمان نے آگے بڑھ کر اسے گرنے سے بچا لیا :

”آپ لوگوں کو گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے صرف ایک فون کریں گے۔ آپ لوگوں کو بالکل کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ لوگ بھی کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔“

”تو آپ وہی ہیں۔ جو پشیل جیل سے بھاگے ہیں۔“

”ہاں! ہم وہی ہیں۔“

”تب تو آپ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ اس جیل سے نکل کرنا عام مجرموں کا کام نہیں ہے۔“

”ہم مجرم نہیں ہیں۔ ہمیں مجرم بنا دیا گیا ہے۔ ان بچوں کے چہروں کی طرف دیکھیں۔ کیا یہ آپ کو مجرم نظر آتے ہیں؟ انھوں نے محمود، فاروق اور خزانہ کی طرف اشارہ کیا۔“

انھوں نے فوراً ان کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیے۔

”اور ہم لوگ۔ ذرا ان کی طرف دیکھیے۔ ان کی عمر دیکھیے۔ ان کا چہرہ دیکھیے۔ کیا یہ آپ کو مجرم نظر آتے ہیں؟ انھوں نے پروفیسر داؤد کی طرف اشارہ کیا۔“

انھوں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

”یار حمید۔ تم نے میری طرف اشارہ نہیں کیا۔ کیا میں تمہیں مجرم نظر آتا ہوں؟ خان رحمان نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔

”نہیں۔ نہیں تو۔ بالکل نہیں۔ تم تو ہم سے بھی زیادہ شرافت نظر آتے ہو۔ وہ مسکرائے۔

”نیر۔ آپ لوگ فون کر لیں۔ ہم کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔ لیکن یہاں کی حکومت کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ کہ آپ لوگوں نے ہمارے ہاں سے فون کیا تھا۔“
”کم از کم ہمارے ذریعے سے انہیں یہ بات ہرگز معلوم نہیں ہو گی۔“

”کیا مطلب۔ کیا آپ کے خیال میں ہمارے ذریعے سے معلوم ہو جائے گی انہیں یہ بات۔“

”نہیں! ہو سکتا ہے۔ وہ خود اپنے ذرائع سے معلوم کر لیں۔ لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں۔ ہم ایسا انتظام کر کے جاتیں گے کہ آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔“
”وہ کیسے؟“

”پہلے ہم فون کر لیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے۔“
”اچھی بات ہے۔“

اور انیکٹر حمید فون پر جم گئے۔ پندرہ منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد کہیں جا کر صدر صاحب کی آواز سنائی دی:
”حمید! یہ تم ہو؟ ان کے بلے میں زمانے بھر کی حیرت تھی۔

”بس سر! انہوں نے خود کہا۔

”تب پھر۔ وہ کون لوگ ہیں۔ جو آج مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔“

”کیا۔ کیا وہ لوگ آپ سے ملاقات کر چکے ہیں سر؟“
”انیکٹر حمید نے کانپ کر کہا۔

”ہاں! کر چکے ہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“

”کیا نہیں ہو سکتا۔“

”یہ کہ انہوں نے آپ سے ملاقات کر لی ہو۔ کیا آپ جان نہیں سکتے۔ کہ وہ نقلی ہیں۔“

”مجھے شبہ ہو گیا تھا حمید۔ لیکن میں نے ان پر ظاہر نہیں کیا۔“

”اس بات کو چھوڑیں۔ انہیں آپ کو شبہ ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسٹر رابل کو تو بس آپ سے ملنا تھا۔“

”اور کیا تمہارے خیال میں — میں نے اس سے ہاتھ ملا لیا ہو گا۔“ صدر صاحب پہنچے۔
 ”ہائیں۔ تو کیا آپ نے ہاتھ نہیں ملایا تھا؟“ انپکٹر جمشید چمکے۔
 ”نہیں۔“

”تو پھر؟“ وہ جلدی سے بولے۔

”پھر یہ کہ پہلے اس نے فون پر بات کی تھی۔ لیکن تم مجھ سے خاص انداز میں بات کرتے ہو، اس لیے میں فوراً سمجھ گیا کہ کوئی شخص تمہاری آواز میں بات کر رہا ہے۔ لہذا میں چوکس ہو گیا۔ وہ فوراً ملاقات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ولیریاڈ سے لوٹ آئے ہیں اور اس سازش کا سراغ لگا لائے ہیں۔ جو میرے خلاف کی گئی تھی۔ خیر۔ میں نے انہیں ملاقات کی اجازت دے دی۔ ایسے میں مجھے سیوا پھول کا خیال آیا۔ میں نے فوراً دستانے منگوا کر پہن لیے۔“

”بہت خوب؛ آپ تو پورے جاسوس ہوتے جا رہے ہیں سر۔“
 ”پورا نہیں۔ آدھا۔ پورے تو تم ہو۔ یہ باتیں

میں نے تمہی سے سیکھی ہیں۔“
 ”خیر۔ پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا۔ انہوں نے ملاقات کی۔ وہ سب تم سب کے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ان کا پول تو پہلے فون پر ہی کھل گیا تھا۔ لہذا میں ان کے چکر میں آنے والا کہاں تھا، بس۔ ان کی باتیں سن کر، ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور انہیں رخصت کر دیا۔ لیکن میں نے رابل کے چہرے پر مایوسی صاف دیکھ لی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”تو آپ نے یہ بات بھی جان لی تھی کہ وہ رابل ہے؟“ انپکٹر جمشید نے کہا۔

”نہیں بھئی۔ یہ تو تم نے اب بتایا ہے۔ وہ بولے۔“
 ”اس وقت وہ کہاں ہیں؟“
 ”تمہارے گھر۔“

”اور اتب تو بیگم ان کی اچھی طرح خاطر تواضع کر رہی ہوں گی۔“

”ہاں! وہ ابھی نھوڑی دیو پہلے ہی یہاں سے واپس گئے ہیں۔ اور تمہارا گھر اس وقت مڑی کے پہرے

میں ہے۔

"بہت خوب۔ جو ہم چاہتے تھے۔ وہ ہو گیا۔ آپ بال بال بچ گئے۔ اچھا ہی ہوا۔ میں نے آپ کو سیاہ پھول کی کہانی سنا دی تھی۔ اب آپ انہیں فوراً گرفتار کرالیں۔ اور ان کی جگہ ہمدی واپسی کا مطالبہ ویریاڑ سے کریں۔ ادھر میں یہاں کی حکومت سے رابطہ کرتا ہوں۔ لیکن نہیں۔ کام کچا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے آپ انہیں گرفتار کر کے مجھے ان نمبروں پر فون کریں۔ یہ کمزور انہوں نے اس فون کے نمبر صدر کو نوٹ کرا دیے۔

"میں ابھی چند منٹ بعد فون کرتا ہوں۔" وہ انتظار کرتے رہے، آخر فون کی گھنٹی بجی، صدر صاحب کی آواز سنائی دی :

"ہاں جمشید ! ان لوگوں کو پوری طرح قابو کر لیا گیا ہے۔ اور یہ کام ہم سے پہلے ججائی صاحبہ کر چکی تھیں۔ یہ کہنے کے ساتھ وہ ہنسنے لگی۔

"کیا مطلب۔ انہوں نے کیا کیا سر؟" یہ کہ۔ پہلے تو ان کی آمد پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ان کے لیے کھانا تیار کرنے چلی گئیں۔

صرف چند منٹ بعد مزے دار ترین کھانے ان کے سامنے لا رکھے۔ ان کھانوں کو کھا کر وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گئے۔ ابھی وہ ہمیں فون کرنے ہی جا رہی تھیں کہ مٹری مینوں نے دروازے کی گھنٹی بجادی اور انہوں نے انہیں ان کے حوالے کر دیا۔

"بہت خوب ! مزا آگئی۔ بیگم، ہو تو ایسی۔ میرا خیال ہے۔ آئندہ زندگی میں رائل ایسا منصوبہ نہیں بنائے گا۔" ہاں ! بالکل۔" صدر صاحب ہنسنے لگے۔

"اب میں یہاں کی حکومت سے بات کرتا ہوں، آپ بھی ان سے بات کریں۔ یہ فوراً تبادلے پر تیار ہو جائیں گے۔" ان شاء اللہ۔

اب انپکٹر جمشید گھر کے افراد کی طرف متوجہ ہوئے :

"اب یہاں پولیس آئے گی۔ ہم خود کو پولیس کے حوالے کر رہے ہیں۔ لہذا آپ خود کو بندھوا لیں۔ اس طرح آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔" یہ۔ یہ۔ یہ ٹھیک رہے گا۔

"اور اس سے پہلے کہ ہم آپ کو باندھیں۔ یہ رقم وصول کر لیں۔" انپکٹر جمشید نے جیب سے چند کرنسی نوٹ نکال کر

ان کی طرف بڑھا دیے۔ کرنسی نوٹ ان کی خفیہ جیب میں موجود تھے۔

"یہ - یہ کیا ہے؟"

"یہ - ہم نے جو یہاں سے فون کیا ہے - اس کا خرچ - وہ بولے۔"

"نہیں نہیں - اس کی ضرورت نہیں؟ نوجوان نے کہا ویسے وہ حد درجے حیران نظر آ رہے تھے - شاید ایسے لوگ انھوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے -

"یہ تو آپ کو لینے پڑیں گے - ہماری وجہ سے آپ پر بوجھ کیوں پڑے؟"

اور اسے نوٹ لینا پڑے - پھر انھوں نے ان لوگوں کو نرمی سے ہانده دیا - اور اس کے بعد نزدیکی پولیس اسٹیشن کو فون کیا - پولیس فوراً وہاں پہنچ گئی -

دسک دی گئی تو انکسٹر جمشید نے دروازہ کھول دیا :
"آپ - آپ لوگ وہ ہیں - جو پیشل جیل سے بھاگے ہیں - پولیس آفیسر نے کانپ کر کہا -

"ہاں! ہم وہی ہیں - اور اب خود کو پولیس کے حوالے کر رہے ہیں -

"آخر کیوں - اگر خود کو پولیس کے حوالے کرنا تھا تو

فراہ ہونے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہاں سے نکلے صرف اس لیے تھے کہ اپنے ملک کے صدر کو فون کرنا تھا - جو ہم نے یہاں سے کر لیا - لہذا اب بھاگنے دوڑنے کی کیا ضرورت - اب تو آپ لوگ ہمیں خود حفاظت سے ہمارے ملک پہنچائیں گے -

"کیا مطلب - وہ کیسے؟ پولیس آفیسر نے چونک کر کہا -

"وہ ایسے کہ مسٹر رابل اور ان کے ساتھی اب ہمارے ملک کی قید میں ہیں -

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"شاید آپ کو ان تمام معاملات کے بارے میں کچھ پتا نہیں - خیر - ہماری گرفتاری کی صورت میں آپ کو کیا کرنے کی ہدایات ہیں؟"

"آپ لوگوں کو فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچانے کا حکم ہے -

"بس تو پھر آپ ہمیں وہیں پہنچا دیں - اور ہاں -

ان لوگوں کو کھول دیں - ہم نے ان بے چاروں کو بلاوجہ ہریشان کیا - انھوں نے گھر کے افراد کی طرف اشارہ کیا -

پولیس نے انھیں کھول دیا - اور ان لوگوں کو لے

کر وہاں سے نکلی - اس وقت انھوں نے گھر کے افراد پر

ایک نظر ڈالی - وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کا شکریہ

ادا کر رہے تھے۔ وہ بھی دبے انداز میں سکرا دیے۔
یہ گویا ان کے شکریے کا جواب تھا۔

انھیں ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا۔ بڑے بڑے آفیسر
ان کے گرد جمع ہو گئے اور سوالات کی بھرمار کر دی۔
تنگ آکر انکسٹر جنسڈ ہاتھ اٹھا کر بولے:

”میری بات سن لیں۔ بات صاف ہو جائے گی۔
آپ کو کوئی الجھن نہیں رہے گی۔
اچھا بتائیں۔“

انھوں نے تفصیل سنا دی اور آخر میں بولے:

”ہم جتنے آدمی ہی قریباً آپ کے ہمارے ملک کی قید
میں ہیں۔ لہذا ہمارا آپس میں تبادلہ کرا لیں۔ یہی آپ
لوگوں کے حق میں بہتر رہے گا اور اگر آپ یہ منظور نہیں
کریں گے تو فرار ہم یہاں سے پھر بھی ہو جائیں گے، اس
صورت میں وابل اور ان کے ساتھی ہمیں صفت میں پھین
گے۔ کیا سمجھے؟“

”ہم اوپر والے حکام سے بات کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ
کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔“ ایک آفیسر نے کہا۔
”ضرور۔ کیوں نہیں؟“ انھوں نے کہا۔

اور پھر کچھ دیر بعد انھیں اعلیٰ حکام کے سامنے پیش

کیا گیا۔ ایک آفیسر نے ان سے کہا:

”ہمارے خیال کے مطابق یہ اطلاع غلط ہے کہ وابل
اور ان کے ساتھی ہمارے ملک میں پکڑے جا چکے ہیں۔
وہ بہت جلد یہاں آنے والے ہیں۔“

”بہت جلد میری بات کی تصدیق ہونے والی ہے۔“ انھوں
نے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو ہم پہلے وابل سے بات کریں گے۔
جب وہ تمھاری بات کی تصدیق کر دیں گے۔ اس وقت
ہم تمھاری حکومت سے بات کر سکیں گے۔“

”ہماری حکومت کا بہت جلد فون آنے والا ہے۔“

”ہم انتظار کر رہے ہیں۔
آخر فون کی گھنٹی بجی۔ آفیسر فون پر بات کرنے لگا۔
پھر اس نے کہا:

”ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ لوگ پہلے ہمارا ایلین
کرائیں گے اور اس کی صورت صحت یہ ہے کہ وابل ہم
سے فون پر بات کرے۔“

کچھ دیر تک فون پر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر
انھیں ایک جہاز پر سوار کرا دیا گیا۔ جہاز ان کے ملک
کے ایر پورٹ پر اترا۔ اور صدر مملکت نے ان کا

استقبال کیا :

" کیا آپ رابل اور اس کے ساتھیوں کو بھیج چکے ہیں ؟
اینگلٹر جمشید نے پوچھا۔

" ہاں ! معاہدہ یہی طے ہوا تھا۔ ادھر سے ہم بھیجیں،
ادھر سے وہ۔"

" اور اس بات کی کیا ضمانت لی گئی کہ وہ دھوکا
نہیں کریں گے؟"

" درمیان میں ایک بڑے ملک کو۔ جو دونوں کا دوست
ہے۔ ضامن بنایا گیا۔"

" بہت خوب : تب تو ٹھیک ہے۔"

" اس کا مطلب ہے۔ سیاہ پھول والا کیس یہاں
ختم ہو گیا؟ خان دھان بولے۔

" نہیں۔ ابھی کیس باقی ہے۔"

" کیا مطلب؟ وہ چونکے۔"

" اب اس میں باقی رہنے والی بات کیا ہے؟ خان
دھان نے پوچھا۔

" اصل مجرم۔ اینگلٹر جمشید مسکرائے۔

" اصل مجرم۔ کیا مطلب؟"

" ہاں ! اس کیس کا اصل مجرم ابھی آزاد ہے۔ یہیں

اسے گرفتار کرنا ہے۔ وہ بولے۔

" لیکن جمشید۔ اس کیس کا اصل مجرم تو انشادجہ ہے۔
اور تم اتنے بڑے ملک کو تو گرفتار کرنے سے رہے۔ صدر
صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

" آپ سمجھے نہیں۔"

" تو سمجھا دیں نا۔ صدر صاحب مسکرائے۔

" بات دراصل یہ ہے کہ انشادجہ نے یہ کام کسی
مقامی آدمی کے اشارے پر کیا ہے۔ جب تک یہ لوگ
کسی مقامی آدمی کو ساتھ نہیں ملاتے۔ اس قسم کے
بڑے منصوبوں پر ہرگز عمل نہیں کرتے۔ اینگلٹر جمشید نے
جلدی جلدی کہا۔

" اوہ ! ان کے منہ سے نکلا۔"

" آپ نے رابل کے ساتھ ٹام روڈ کو تو نہیں ادھر
بھیج دیا؟"

" ٹام روڈ کا نام تو انھوں نے پہلے رکھا تھا۔ اس
کے بغیر تو وہ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔
صدر صاحب بولے۔

" مطلب یہ کہ انھوں نے کہا تھا کہ باقی لوگوں کے ساتھ
ٹام روڈ کو بھی ادھر بھیجنا پڑے گا۔"

"اں ایسی بات ہے۔"
 "ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔"
 "لیکن تم کیا دیکھ لو گے جمشید۔ معلوم تو ہو۔"
 "یہی کہ اس سازش کے پیچھے کس مقامی آدمی کا ہاتھ ہے۔"
 انھوں نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

پروفیسر اربان

انپکٹر جمشید کی کار ایک بڑی کوٹھی کے سامنے رکھی،
 محمود نے نیچے آکر درتک دی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے
 دروازہ کھولا :
 "جی فرمائیے۔"

"ہمیں خان آفریدی صاحب سے ملنا ہے۔"
 "آپ اپنا نام بتائیں گے یا کارڈ ہے آپ کے پاس؟"
 "کارڈ لے جائیں۔" انھوں نے اپنا کارڈ نکال کر دے دیا۔
 ملازم اندر چل گیا۔ لیکن پہلے اس نے انھیں ایک
 چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا تھا۔ اس کمرے کے دروازے
 پر انتظار گاہ لکھا تھا۔ آخر ملازم واپس آیا اور بولا :
 "چلیے صاحب۔"

اب وہ انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔
 بلند ہی قدموں کی آہٹ ابھری اور ایک لمبے قد کا آدمی

اندرو داخل ہوا :

" انسپکٹر جمشید صاحب - آپ کو مجھ سے کیا کام آپڑا؟ ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

" تشریف رکھیے خان صاحب - پھولوں کی نمائش کے سلسلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

" اس سلسلے میں کیا کوئی گڑبڑ ہے؟

" گڑبڑ کے بارے میں تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔

" آپ کا اشارہ سیاہ پھول کی طرف ہے؟

" ہاں جناب!

" لیکن اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ

فوراََ بولے۔

" دیکھتے جناب! میں نے آپ پر یہ الزام نہیں لگایا۔

آپ اس نمائش کے انچارج تو ہیں نا؟

" ہاں! بالکل ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔

" میں جانتا ہوں - اس کا یہ مطلب نہیں - میں تو آپ

سے چند سوالات پوچھنا چاہتا ہوں - اگر آپ ان کے جوابات

دے دیں تو میں شکر گزار ہوں گا۔

" اچھا! پوچھیے۔

" پہلی بات - ہمارے ملک میں بین الاقوامی سطح پر

پھولوں کی نمائش کا یہ پہلا موقع تھا، اس سے پہلے کبھی ایسی نمائش نہیں ہوئی - ملکی سطح پر ضرور ہر سال پھولوں کی نمائش ہوتی ہے - لیکن پوری دنیا کے ملکوں کے پھولوں کی نمائش کا یہ پہلا موقع تھا - یہ تجویز کس کی تھی؟ بس مجھے تو آپ اتنا بتا دیں۔

" انشاورج کی - انھوں نے فوراََ کہا۔

" میں ملکی سطح پر پوچھ رہا ہوں - ہمارے ملک میں

یہ کس کی تجویز تھی - انشاورج کو یہ حق نہیں ہے کہ ہمارے

ملک میں بین الاقوامی کوئی نمائش طے کرے۔

" یہ تجویز میری تھی - آخر کار انھوں نے کہا۔

" اوہ! ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

" دیکھیے جناب - آپ غلط مطلب نہ لیں - سیاہ پھول دالے

معاملے سے میرا ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

" میں یہ کہہ رہی نہیں رہا - آپ خود بار بار یہ بات کہ

رہے ہیں۔

" اس لیے کہ میں جانتا ہوں - آپ کی تفتیش اسی

سمت میں جا رہی ہے۔

" آپ کو کیا معلوم کہ میری تفتیش کس سمت میں جا رہی

ہے - یہ کام میرا ہے، آپ کا نہیں - چلیے ہمیں یہ

کام کی بات آپ نے بتا دی کہ یہ تجویز آپ کی تھی —
 آپ نے سب سے پہلے کس کے سامنے یہ تجویز رکھی؟
 ”ظاہر ہے — وزیر خارجہ صاحب کے سامنے ہی رکھ سکتا
 تھا۔ باقی ملکوں سے تو دبی بات کر سکتے تھے نا۔“
 ”شکریہ! اب ہم اجازت چاہیں گے۔“
 ”اچھی بات ہے“ انھوں نے فکر مند انداز میں کہا۔

اور پھر وہ باہر نکل آئے۔
 ”ابا جان! کیا آپ کے خیال میں ہمارے ملک کا
 کوئی آدمی صدر صاحب کو راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ خود
 نے بے چین ہو کر کہا۔
 ”ہاں! انھوں نے مختصر جواب دیا۔
 ”اور وہ آدمی خان آفریدی ہیں؟“
 ”ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

اب ان کی کار وزیر خارجہ کے دفتر کے سامنے رکھی،
 جلد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ وزیر خارجہ کے
 چہرے پر ناگواری صاف نظر آ رہی تھی۔ گویا انھیں ان
 کی آمد اچھی نہیں لگی تھی۔ آخر انھوں نے منہ بنا کر کہا۔
 ”مسٹر انپیکٹر — آپ صدر صاحب کے منہ چرٹے ہوئے
 ہوں گے۔ میں آپ کے دباؤ میں آنے والا نہیں۔“

آئندہ آپ پہلے سے وقت لے کر ملاقات کیجیے گا۔
 میں اس طرح ملاقاتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ جس
 طرح آپ لوگ صدر صاحب سے ملاقاتیں کر لیتے ہیں،
 انھوں نے تو اپنے آپ کو آپ کے ہاتھوں میں کھلونا
 بنا دکھا ہے۔“

”شکریہ! میں آئندہ اس بات کا خاص خیال
 رکھوں گا اور اگر کوئی فوری ضرورت پیش نہ آگئی تو پہلے
 سے وقت لے کر ہی ملاقات کروں گا۔“ انھوں نے پرسکون
 آواز میں کہا۔

”کیا مطلب — اگر آپ کو کوئی فوری ضرورت پیش
 آگئی تو گویا آپ پھر وقت لیے بغیر ملاقات کے لیے
 آ جائیں گے۔“
 ”جی ہاں! وہ تو مجبوری ہو گی۔“

”لیکن میں ملاقات سے انکار کر دوں گا۔“
 ”یہ اس وقت دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو آپ
 ہمیں ملاقات کا وقت دے چکے ہیں۔“

”ابھی بات ہے۔ کیسے — کیا بات ہے؟“
 ”پھولوں کی نمائش کے سلسلے میں چند باتیں — یہ
 تجویز خان آفریدی کی تھی — ان کی تجویز پر آپ نے

دوسرے ملکوں سے بات طے کی؟
 "ہاں! ٹھیک ہے۔"

"کیا آپ نے صدر صاحب سے مشورہ کیا تھا؟
 "نہیں! میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"
 "اور جب افتتاح کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔
 تو کیا اس وقت صدر صاحب سے بات کی گئی؟
 "نہیں۔ سارا پروگرام طے کرنے کے بعد انھیں
 بتایا گیا تھا کہ انھیں پھولوں کی نمائش کا افتتاح کرنا ہے۔
 اور انھوں نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں
 کیا۔ کہ ان سے پوچھے بغیر ایک پروگرام کس طرح ترتیب
 دے دیا گیا۔"

"ہاں! انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
 "بہت خوب! سیاہ پھول والی سازش انشارجہ کی
 ہے، لیکن ہمارے خیال میں اس سلسلے میں کوئی مقامی
 آدمی بھی شامل ہے۔ آپ کے خیال میں وہ کون ہو
 سکتا ہے؟
 "کوئی بھی نہیں۔ میرے خیال میں تو اس سازش
 میں ملکی آدمی کا ہاتھ ہے ہی نہیں۔"
 "اگر نہیں ہے۔ تو پھر اس بات کا انتظام کیوں

نہیں کیا گیا کہ کوئی ذہریلا پودا اس نمائش میں نہ
 آنے پائے؟ انپیکٹر جمشید نے ڈرامائی انداز میں کہا۔
 "کیا مطلب؟ وزیر خارجہ زور سے چوکنے۔"

"یہ بات پوری دنیا کے نباتات کے ماہر جانتے
 ہیں کہ بعض ملکوں میں اس قدر ذہریلے پودے اور
 پھول پائے جاتے ہیں کہ ان سے جسم مس کر جائے
 تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک جانے
 سے ان کی بو سے ہی آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے یا
 مر جاتا ہے۔ لہذا اس قدر بڑی نمائش میں آنے
 والے پودوں کو اس لحاظ سے چیک کرنا یا کم از کم
 معلومات لینا کیوں ضروری خیال نہ کیا گیا؟"

"شاید اس لیے کہ یہ ہمارے لیے پہلا موقع تھا
 اور ہمیں اس بات کا خیال نہیں آیا۔
 "لیکن نباتات کے ماہرین نے تو اس طرف ضرور
 توجہ دلائی ہو گی۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔
 "شکریہ۔ آؤ جی چلیں۔ انھوں نے خشک لمحے میں کہا۔
 وزیر خارجہ انھیں گھور کر رہ گئے۔ اب ان کی کار
 ملک کے سب سے بڑے ماہر نباتات کی کوٹھی کے سامنے

”زکی۔ ان کا نام پروفیسر اربان تھا۔ انھوں نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔“

”پھولوں کی نمائش کے بارے میں آپ کو پہلے سے پتا چل گیا تھا۔ یہ بات ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں بالکل۔“

پھر آپ نے حکومت کی توجہ اس طرف کیوں نہ دلائی کہ کچھ پودے انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں پہلے چیکنگ کی جائے۔ یا کم از کم دوسرے ملکوں سے آنے والے نمائندوں سے اس بات کی گادنی لے لی جائے کہ ان کے ملک کا کوئی پودا خطرناک تو نہیں ہے؟

”میں نے اپنا یہ فرض پورا کیا تھا۔“ پروفیسر اربان بولے۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے وزیر خارجہ صاحب کی توجہ اس طرف دلائی تھی۔ پروفیسر اربان نے کہا۔“

”لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کی توجہ اس طرف نہیں دلائی گئی۔“

”کیا۔ وہ یہ بات کہتے ہیں؟“ پروفیسر اربان دھک سے رہ گئے۔

”ہاں جناب! آپ نے انھیں یہ بات کس طرح بتائی تھی؟“

”فون پر۔“

”یہ آپ کی غلطی تھی۔ انھوں نے برا سامنہ بنایا۔“

”کیا مطلب؟ وہ چونکے۔“

”مطلب یہ کہ آپ کو انھیں تحریری طور پر اطلاع دینا چاہیے تھی۔“

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس بات سے انکار کر دیں گے۔“

”تب تو معاملہ صاف ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟ وہ چونکے۔“

”اس معاملے میں وزیر خارجہ کا ہاتھ ہے۔“

”یہ۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ گھبرا گئے۔“

”کیوں۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو وزیر خارجہ ہیں۔ بعض ملکوں کے تو صدر اور

وزیر اعظم تک اپنے ملک سے غداری کر بیٹھتے ہیں۔“

”نہیں۔ یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔“

”اس لیے کہ یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ اچھا شکریہ!“

وہ ایک بار پھر وزیر خارجہ کے پاس پہنچے۔ انھوں

نے انھیں انجمن کے عالم میں دیکھا۔

”اب کیا ہے انپکٹر جمشید۔ میرے خیال میں تو یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ اب اس کیس کے اصل مجرم رابل وغیرہ تھے۔ وہ تو آپ لوگوں کی وجہ سے قید میں رکھے نہیں جاسکے۔ اب آپ اپنے ملک میں مجرم تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“ ہم نے ضرورت محسوس کی تو رابل وغیرہ کو بھی پکڑ لائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”خیر۔ اب مجھ سے کیا کام ہے؟“

”آپ کو فون پر پروفیسر اربان نے یہ کہا تھا کہ پودوں کی چیلنگ کرائی جائے۔“

”نہیں تو۔ انھوں نے تو مجھے ہرگز یہ بات نہیں بتائی تھی۔“ وہ فوراً بولے۔

اور وہ دھک سے رہ گئے۔

اجازت نامہ

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھاب۔ پروفیسر اربان کا کہنا ہے کہ آپ کی توجہ انھوں نے بعض پودوں کے انتہائی نہریٹے ہونے کی طرف دلائی تھی۔ اور آپ کو رہے ہیں کہ اس قسم کی کوئی بات انھوں نے نہیں کہی۔“

”اے! یہی بات ہے۔ اگر انھوں نے یہ بات کہی ہوتی تو میں ضرور پودے انہی سے چیک کراتا۔“

”اچھا بھاب۔ شکریہ!“

انپکٹر جمشید اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ باقی لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا:

”آپ کے لیے میرا ایک مشورہ ہے انپکٹر جمشید۔“

”جی فرمائیے۔“

”آپ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔ ہمارے ملک کے صدر اس پھول کے نہرے سے بال بال بچ گئے۔“

کیا ہمارے لیے یہی کافی نہیں؟
 لیکن دشمن پھر کوشش کرے گا۔ میں تو اس کی آئندہ
 کوشش کے خاتمے کے لیے کام کر رہا ہوں۔ اور یہ اسی
 وقت ممکن ہے۔ جب وہ خود جیل میں ہو۔ باہر رہ
 کر تو وہ طاقت ور ہو گا اور کسی وقت بھی کوئی اور
 سازش کر سکتا ہے۔

”اچھی بات ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے
 آپ کو خبردار کر دیا ہے۔“

”خبردار کر دیا ہے۔ کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا
 چاہتے ہیں کہ اگر میں نے اس معاملے کو ختم نہ کیا تو میں
 نقصان اٹھاؤں گا۔“

”نقصان تو پھوٹی سی چیز کو کہتے ہیں۔ آپ لوگ تو
 اپنی جانوں سے جا سکتے ہیں۔“

”اوہ اچھا۔ آپ نے اچھا کیا کہ ہمیں بتا دیا۔ آخر
 کو جانیں تو سب کو پیاری ہیں۔“

”ہاں بالکل۔ اور خاموشی اختیار کر کے آپ مجھ سے
 بے تحاشہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کئی بڑے پلاٹ میں آپ
 کو دے سکتا ہوں۔ اس قسم کے اور بے تحاشہ فائدے
 پہنچا سکتا ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ۔ میں اس خوب صورت پیش کش
 پر خوب غور کروں گا۔ ویسے آپ نے یہ کب سے جان
 لیا کہ ہم لوگ بھی اس قسم کے کام کر سکتے ہیں؟ وہ
 مسکرا کر بولے۔“

”اس دنیا میں ہر آدمی کی ایک قیمت ہے۔ جب
 اس کی وہ قیمت لگتی ہے تو وہ خود کو بیچ دیتا ہے۔“
 ”بہت خوب سر۔ کیا اس تعریف میں آپ بھی شامل
 ہیں؟“ انپکٹر جمشید نے سرد آواز میں پوچھا۔

”انپکٹر جمشید۔ میں بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔“
 ”آپ نے خود یہ الفاظ بیان فرماتے ہیں کہ اس دنیا
 کے ہر آدمی کی ایک قیمت ہے۔ ہر آدمی میں تو آخر آپ
 بھی آ جاتے ہیں۔“

”ہاں! بالکل آ جاتا ہوں۔ تم سے جو ہو سکتا ہے
 کر گزرو۔ اور دیکھو میں نے دوسری بار تمہیں وقت لیے
 بغیر ملاقات کا موقع دے دیا۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”وقت نے کر ملاقات کرنے کا عادی تو خیر میں بھی
 نہیں ہوں۔ اگر تیسری ملاقات کی ضرورت پیش آئی تو بھی
 ہم اسی طرح آئیں گے اور ملاقات کر لیں گے۔“
 ”ناممکن۔ وہ بولے۔“

"اب ہم چلتے ہیں۔"

وہ وہاں سے نکل کر سیدھے صدر صاحب کے پاس پہنچے اور یہ سن کر خیر خیر نہیں سنا۔ صدر صاحب کہتے میں آگئے، پھر بولے :

"اس کا مطلب ہے۔ اس سازش میں وزیر خارجہ کا ہاتھ ہے۔"

"اں جناب !"

"دل نہیں مان رہا۔"

"تب پھر پروفیسر اربان جھوٹ بول رہے ہوں گے۔"

"انھیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ صدر صاحب

انھیں کے عالم میں بولے۔

"اگر وہ سچ بول رہے ہیں تو پھر وزیر خارجہ سازش میں شریک ہیں۔"

"ایک منٹ۔" یہ کہہ کر انھوں نے ٹیلی فون آپریٹر کو پروفیسر اربان کے نمبر ملانے کی ہدایت کی۔ جلد ہی ان کی آواز سنائی دی تو وہ بولے :

"پروفیسر صاحب۔ یہ میں ہوں۔ ارسلان خان۔"

"اوہ سر آپ۔ فرمائیے۔"

"آپ کا کہنا ہے کہ آپ نے وزیر خارجہ کو یہ بات

سنا دی تھی کہ بعض پودوں سے حد درجے زہریلے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو صرف چھو دینے سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ اور بعض کی صرف خوشبو سے آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یا مر سکتا ہے۔ لہذا آپ کو ماہرین کے ذریعے دوسرے ملکوں سے لائے جانے والے پودوں کو چیک کرایا جانا چاہیے۔"

"سر۔ یہی بات ہے۔ میں نے ان سے یہ بات کہی تھی۔"

"آپ ذرا میرے پاس آ جائیں۔"

"جی بہتر! انھوں نے کہا اور صدر صاحب نے ریسور رکھ دیا۔"

"یہاں بلا کر آپ کیا کریں گے؟"

"ان کا تحریری بیان لیں گے۔ اس بیان کی بنیاد پر وزیر خارجہ سے جواب طلبی کی جائے گی اور اگر وہ اطمینان کے قابل جواب نہ دے سکے۔ تو ان پر کیس چلے گا۔"

"شکریہ سر۔ ہم یہی چاہتے ہیں۔"

انھیں انتظار کرتے کافی دیر گزر گئی۔ لیکن پروفیسر اربان وہاں نہ پہنچ سکے۔ صدر صاحب نے پھر ان

کے گھر فون کیا — لیکن وہاں سے بتایا گیا کہ وہ تو کب کے ان کی طرف روانہ ہو چکے ہیں — اب تو وہ پمیشان ہو گئے —

”اب کیا کریں جمشید؟“

”میں دیکھتا ہوں سر — آپ فکر نہ کریں۔“

وہ اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلے اور پروفیسر اربان کے گھر کے راستے پر چل پڑے۔ ان کے ساتھی دونوں طرف دیکھتے جا رہے تھے — ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی نظر آئی — انپکٹر جمشید نے کار روک کر کہا :

”ہو نہ ہو — یہ پروفیسر صاحب کی کار ہے۔“

”تب تو معاملہ گڑ بڑ ہے۔“

وہ جلدی سے کار تک پہنچے — اور پھر بری طرح اچھلے، کار کے اندر پروفیسر اربان کی لاش اپن کا منہ چڑا رہی تھی۔



”اُن مالک ! مجرم نے انہیں ہلاک کر دیا۔“ انپکٹر جمشید کانپ گئے — اور پھر انہوں نے اکرام وغیرہ کو فون کیے،

پھر صدر صاحب کو فون کیا :

”ایک بُری خبر ہے سر۔“

”میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا ہوں — پروفیسر اربان کو قتل کر دیا گیا ہے نا جمشید۔“

”یس سر — یہ حادثہ ہو چکا ہے۔“ انہوں نے غمگین انداز میں کہا —

”فورا یہاں چلے آؤ۔“

”اکرام جونہی یہاں آتا ہے — میں روانہ ہو جاؤں گا سر۔“

”ہاں ! ٹھیک ہے۔“

اب انہوں نے جلدی جلدی لاش کا معائنہ کیا —

رات کے دس بج رہے تھے — سردیوں کی رات تھی — ہو کا

عالم طاری تھا — دُور دُور تک کسی آنے جانے والی گاڑی

کی روشنیاں نظر نہیں آ رہی تھیں —

لاش کے گلے میں ریشم کی ڈوری کا پھندا موجود تھا —

گویا ان کی کار روک کر — ان کا گلا گھونٹا گیا تھا — ان کی

آنکھوں میں آنسو آ گئے — بے چارے پروفیسر اربان — جو

اپنے وطن سے محبت کرتے تھے — جنہیں صدر کی زندگی

عزیز تھی — اور اسی لیے انہوں نے وزیر خزانہ کو خبردار کر

دیا تھا، لیکن وہ شخص کس طرح خبردار ہو سکتا ہے — جو

خود سازش میں شریک ہو۔ انھوں نے ریشم کی ڈوری کو
خود سے دیکھا۔ وہ نیلے اور سُرخ رنگ کی تھی۔ یعنی دوہرے
رنگ کی۔ اچانک خزانہ زور سے چوکی:

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟"

"دسی کا نیلا اور سُرخ رنگ دیکھ کر مجھے ایک بات
یاد آئی ہے۔"

"اوہ وہ کیا؟ محمود نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"تمام روٹ کا لباس بھی سُرخ اور نیلے رنگ کا تھا۔
وزیر خادجہ بھی ہمیں سُرخ اور نیلے لباس میں نظر آئے
تھے۔ اور..."

"اور کیا؟ انیکٹر جیٹ نے پُر جوش انداز میں کہا۔

"اور وزیر خادجہ کے ملازم۔ جس نے دروازہ کھولا۔
اس کے لباس کا رنگ بھی سُرخ اور نیلا ہے؟"

"یا اللہ رحم۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"اسی وقت پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ اکرام تیر
کی طرح ان کے پاس آیا:

"وقت بہت کم ہے اکرام۔ یہاں ایک دو آدمی
چھوڑ کر میرے پیچھے آؤ۔ اور وارنٹس کر کے مزید آدمی
خود وزیر خادجہ کی کوٹھی کی طرف بلا لو۔"

"اس کا مطلب ہے۔ خیریت نہیں ہے۔"

"نہیں۔ جلدی کرو۔"

وہ اپنی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ راستے میں انھوں
نے صدر صاحب کو فون کیا:

"مجھے افسوس ہے سر۔ میں فوری طور پر آپ کی
طرف روانہ نہیں ہو سکا۔ ایک بہت اہم بات سامنے

آئی ہے۔ لہذا پہلے مجرم کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔"

"مجرم۔ کیا مطلب؟ صدر صاحب پوچھنے۔

"وزیر خادجہ سر۔ وہ بولے۔

"اوہ! تو کیا۔ ان کا جرم ثابت ہو گیا ہے؟"

"ہاں سر۔ ہمارے ملک میں باقاعدہ ایک گروہ کام
کر رہا ہے۔ وہ سُرخ اور نیلا رنگ استعمال کرتا ہے۔

مثلاً لباس اگر پہنیں گے تو سُرخ اور نیلا۔ یہاں تک
کہ جو دسی انھوں نے پروفیسر اربان کو ہلاک کرنے کے
لیے استعمال کی ہے نا۔ وہ بھی سُرخ اور نیلے رنگ
کی ہے۔"

"اوہ! ان کے مزے نکلا۔"

"لہذا اب میں اس طرف جا رہا ہوں۔"

"اگر تمہارے پاس مکمل ثبوت ہے۔ تو ضرور انھیں

گرفتار کر لو۔ لیکن اگر ثبوت مکمل نہیں ہے۔ تو ہاتھ نہ ڈالنا جمشید۔ کام خراب ہو جائے گا۔
 "لیکن سر۔ اگر ہم انھیں گرفتار نہیں کریں گے تو زیادہ کام خراب ہو سکتا ہے۔"
 "اچھی بات ہے۔ جو تم مناسب سمجھو، کرو۔"
 "شکریہ سر۔"

وہ وزیر خارجہ کی کوشی پر پہنچے تو بے شمار سادہ لباس والے وہاں ان سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ کوشی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ انھوں نے اکرام کو ہدایات دیں اور اس نے جلدی جلدی ان کی ہدایات اپنے ماتحتوں کو دیں۔ پھر دھک دی گئی۔ جلد ہی ایک ملازم باہر نکلا۔ انھوں نے دیکھا۔ اس کا لباس سُرخ اور نیلا تھا۔ انھوں نے فوراً اسے قابو کر لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"یہ کیا؟"

"من مانی۔" انیکٹر جمشید مسکرائے۔

"جانتے بھی ہیں۔ یہ وزیر خارجہ کا گھر ہے۔"

"اسی لیے تو من مانی کر رہے ہیں۔"

"تب تم لوگوں کا انجام بہت بھانک ہوگا۔"

"انجام کی ہم لوگ پروا نہیں کرتے۔ اکرام اسے جیب میں بٹھاؤ۔"

"آپ کے خیال میں وزیر خارجہ مجرم ہے، لیکن آپ کے ملک کے صدر انھیں مجرم ہرگز نہیں تسلیم کریں گے۔ اس نے ایک اور بات کہی۔"

"سوال یہ ہے کہ کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ خود بھی مجبور ہیں۔ طاقت ان کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے۔"

وہ حیران رہ گئے۔ وزیر خارجہ کا ملازم کس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ حیرت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ اب وہ اندر داخل ہوئے۔ گھر کے سب افراد سوئے پڑے تھے۔ انیکٹر جمشید وزیر خارجہ کے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اب انھوں نے دھک دی تو ان کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی:

"کون۔ روئل۔ کیا بات ہے۔ اس وقت کیوں پریشان کر رہے ہو؟"

"باہر خطرہ ہے سر۔ انھوں نے روئل کی آواز میں کہا۔"

"خطرہ۔ کیا مطلب؟"

"جلدی دروازہ کھولیے۔ بتاتا ہوں۔"

اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر دروازہ کھلا۔
 وزیر خادجہ کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا :
 "یہ کیا۔۔۔ انسپکٹر جمشید یہ آپ ہیں۔ آپ کی یہ جرأت
 کہ میرے گھر میں بغیر اجازت آ گئے اور وہ بھی رات
 کے وقت۔۔۔"
 "سُرخ اور نیلے رنگ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔
 وہ نہ سکا۔"

"کیا کہا۔۔۔ سرخ اور نیلا رنگ۔ وہ فور سے اچھلے۔
 "صدر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ باقی باتیں وہیں
 ہوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں پکڑے تبدیل کر لوں۔"
 "نہیں سر۔ پکڑے آپ وہیں چل کر تبدیل کیجیے گا۔"
 "کیا مطلب۔ آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا۔"
 "پروفیسر اربان کے گلے میں جو پسی پائی گئی۔ وہ
 بھی نیلے اور سُرخ رنگ کی ہے۔"
 "گویا اب آپ مجھ پر پروفیسر اربان کے قتل کا الزام
 بھی لگائیں گے۔"

"مجبوری ہے۔ انسپکٹر جمشید بولے۔
 "آپ جانتے ہیں یا میں کروں پولیس کو فون۔"

"پولیس کو تو ہم خود ساتھ لائے ہیں۔"
 "کیا مطلب؟"
 "اس وقت آپ کی کوٹھی خفیہ پولیس کے گھرے میں ہے۔"
 "نہیں۔ گرفتاری کے وارنٹ دکھائیں۔"
 "اب آپ نے وارنٹ کی بات پھیر دی۔ یہ رہے
 وارنٹ۔ انھوں نے جیب سے خصوصی اجازت نامہ نکال
 کر سامنے کر دیا۔
 "یہ کیسے وارنٹ ہیں؟"
 "پڑھ کر دیکھیں۔ معلوم ہو جائے گا۔"
 انھوں نے جلدی جلدی اجازت نامہ پڑھا اور ان کے
 چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی۔ اچانک وہ تڑپے گرے۔

آخری فیصلہ

اُن کے گرتے ہی انپکٹر جمشید اُچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور یہی چیز انھیں بچا گئی۔ انھوں نے گرتے ہی پستول جیب سے نکال لیا تھا اور اندھا دھند تین چار فائر کر ڈالے تھے۔ ان کے باقی ساتھی بھی پیٹے ہی ادھر ادھر لڑھک گئے تھے۔ پھر انپکٹر جمشید کے پستول سے ایک گولی نکلی اور وزیر خارجہ کے ہاتھ سے پستول نکل گیا۔ جسے فرزانہ نے پکچ کر لیا :
 "ثبوت مکمل ہو گیا۔ اب ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہی۔"

"لاکھ ثبوت پیش کرو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے، میں وزیر خارجہ کا وزیر خارجہ ہی رہوں گا۔ ہاں تم اب انپکٹر نہیں رہو گے۔"
 مجھے انپکٹر رہنے کی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ اپنے

دین، قوم اور ملک کی خدمت کرنا اصل مقصد ہے۔ وہ میں انپکٹر نہ ہوتے ہوئے بھی کر سکتا ہوں۔"

"اب یہی ہو گا۔ تم اس عہدے پر رہے بغیر یہ سب کام کرتے پھرا کرنا۔ انھوں نے جمل کر کہا۔
 "اکرام۔ انھیں ہتھکڑیاں لگا دو۔"

"کیا۔ اب تم مجھے ہتھکڑیاں بھی لگاؤ گے۔"
 "ہاں کیوں نہیں۔ ہر مجرم کو ہتھکڑیاں لگتی ہیں۔ آپ کو لگ گئیں تو کوئی افواہی بات تو ہو نہیں جائے گی۔ اور پھر اکرام نے آگے بڑھ کر انھیں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ اس وقت تک ان کے گھر کے سب لوگ بھی آس پاس جمع ہو چکے تھے۔

"آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ بیگم وزیر خارجہ بولیں۔
 "یہ اس کھیل کا انجام ہوا ہے۔ جو یہ کھیلتے رہے ہیں۔"
 "کیا مطلب؟"

"یہ ملک کی جڑیں کاٹتے رہے ہیں۔ انشاد کے اشادے پر ناپچتے رہے ہیں۔ اس کے اشادے پر انھوں نے صدر صاحب کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن اللہ کو ابھی ان کی موت منظور نہیں تھی۔ ورنہ انھوں نے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔"

"نہیں نہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ ایسے نہیں ہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ الزام ہے۔"

"ابھی ہم یہاں کی تلاشی لیں گے اور آپ کی خدمت میں ثبوت بھی پیش کریں گے۔"

"اوہ! ان کے منہ سے نکلا۔"

"انپکٹر جمشید۔ تم کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکو گے۔"

"بس دیکھتے جائیں۔ چلو بھئی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ حرکت میں آ جاؤ۔ ان کا دعویٰ ہے۔ ہم ثبوت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں ان کا دعویٰ غلط ثابت کرنا ہے۔"

"فکر نہ کریں آبا جان۔ محمود نے پرجوش انداز میں کہا۔"

انھوں نے کوٹھی کی تلاشی شروع کر دی۔ تمام الماریاں اور سیف وغیرہ دیکھ ڈالے۔ ان میں اگر کچھ خفیہ خانے تھے تو ان کو بھی دیکھ ڈالا گیا۔ لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی:

"کیوں ہو گئے نا ناکام؟ وزیر خادجہ بنے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ہم نے اپنا کام ختم نہیں کیا۔"

"اچھا۔ جب کام ختم کر لو۔ بتا دینا۔ وہ بنے۔"

"ضرور جناب! کیوں نہیں؟"

"لیکن ایک بات لکھ لو۔ آج کا دن تم لوگوں کی

ناکامیوں کا دن ہے۔"

"اب لکھنے کے لیے وقت کہاں سے لائیں۔ ہمیں اور بھی تو کام ہیں۔"

"ہنہ! انھوں نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔"

اور پھر انھوں نے اپنا کام نئے سرے سے شروع کیا۔ اس بار وہ تہ خانہ تلاشی کر رہے تھے۔ ابھی تک

انھوں نے تہ خانے کے امکانات پر توجہ نہیں دی تھی۔ تہ خانے کی تلاشی میں وہ دُور نکل گئے۔ انپکٹر جمشید اور

باقی لوگ وزیر خادجہ کے پاس ہی رہ گئے۔ آخر آدھ گھنٹے بعد تینوں کی واپسی ہوئی:

"کیوں۔ نہیں ملا نہ کچھ۔ ٹائیس ٹائیس فٹ۔" وزیر خادجہ نے ہنس کر کہا۔

"جی ہاں! یہی کہہ سکتے ہیں۔ کر ٹائیس ٹائیس فٹ۔ لیکن۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟"

"ٹائیس ٹائیس فٹ، ہماری نہیں۔ آپ کی۔" فاروق مسکرایا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم نے آپ کی کوٹھی کے نیچے ایک عدد تہ خانہ تلاشی کر لیا ہے۔ اس تہ خانے میں بہت کچھ موجود

ہے۔ فرزانہ بولی۔

”کیا۔ نہیں!!! اس کی چیخ بہت بلند تھی۔

”اب بیچنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ فاروق گنگنایا۔

”یہ بھی خوب رہی۔ تم آج شاعری تو نہیں کر رہے۔ فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

”میں کہاں۔ شاعری کہاں۔ بس یہ کہ لو۔ میں کس کھیت کی مولی ہوں۔

”دھت تیرے کی۔ شاعری سے مولی تک جا پہنچے۔ محمود نے جھٹکا کر کہا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو مولی سے شاعری تک پہنچ جاتا ہوں۔ فاروق ہنسا۔

”تو خانے میں اترنے سے پہلے ہمیں کچھ بہت ذمے دار قسم کے لوگوں کو بلا لینا چاہیے۔ انپکٹر جمشید بولے۔

”ہاں ہاں! بلا لو۔ اس نے بے فکری کے عالم میں کہا۔

انپکٹر جمشید نے سپریم کورٹ کے چند ججوں کو فون کیا،

اور بھی کئی بڑے بڑے آفیسرز کو فون کیے۔ اور جب

یہ سب لوگ آگئے تو انہیں پوری صورت حال بتائی۔

وہ سن کر سکتے میں آگئے۔ شاید انہیں یقین ہی نہیں آ

رہا تھا کہ ملک کا وزیر خارجہ غدار بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد انہیں تہ خانے کی دریافت کے بارے

میں بتایا گیا اور آخر میں انپکٹر جمشید بولے:

”ہم نے آپ لوگوں کے انتظار میں تہ خانے

میں اتر کر نہیں دیکھا۔ اب آپ سب کی موجودگی میں

ہی دیکھیں گے۔

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ سپریم کورٹ کے ایک

جج بولے۔

”شکریہ سر۔

پھر سب لوگ ایک ایک کر کے تہ خانے میں اترنے

لگے۔ وزیر خارجہ کو تمام لوگوں کے درمیان میں رکھا گیا،

تاکہ وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں۔

تہ خانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس ایک کمرے

جتنا تھا، لیکن اس میں الماریاں موجود تھیں۔ ان

الماریوں میں کاغذات موجود تھے۔ فائلوں کی صورت

میں۔ ان فائلوں کو کھولا گیا۔ اور پھر ان کی آنکھوں

میں خوف دوڑ گیا۔ وزیر خارجہ ان کاغذات کی رو

سے باقاعدہ انشاد کے آدمی تھے۔ اور وزیر خارجہ بننے

سے بہت پہلے سے ان کے ایجنٹ چلے آ رہے تھے

اور شاید انشا دج کی مہربانی سے ہی وہ اس عہدے تک پہنچے تھے۔ وہاں ایک المادی میں ایک بہت طاقت ور ٹرانسیرٹ بھی تھا۔ گویا اس پر وہ انشا دج سے بات کرتے تھے۔ ان سب چیزوں کا سب نے معائنہ کر لیا تو انیکٹر جمشید ہوئے :

"کیا آپ کو ابھی اور ثبوت کی ضرورت ہے؟"
"تم لوگ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔"
"خیر دیکھیں گے جی۔"

اب وہ انھیں صدر صاحب کے پاس لے گئے۔ تمام ثبوت، ان کے سامنے رکھ دیے گئے۔ تمام تفصیلات سنائی گئیں۔

"اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہ کہ اس سارے معاملے کو گول کر دیں۔ پی جائیں۔ اور مجھے میرے عہدے پر کام کرنے دیں، اسی میں آپ کے ملک کی جلائی ہے۔ ورنہ انشا دج اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔"

"ایک بات آپ بھی سن لیں۔ میں مجرموں کو چھوڑنے کا عادی نہیں ہوں۔ خاص طور پر ان لوگوں کو، جو ملک سے غداری کریں۔ اور آپ بھی اس

گروپ میں شامل ہیں۔ لہذا آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔" جیسی دیکھ لو۔ نرمی کر دو گئے، فائدے میں رہو گئے۔ وزیر خادجہ نے کہا۔

"ملک دشمنوں سے نرمی۔ کیا بات کرتے ہو؟"
"اچھی بات ہے۔ بہت جلد آپ دیکھ لیں گے۔"
اور پھر تھوڑی دیر بعد صدر صاحب کے نام انشا دج کا فون موصول ہوا :
"ہم نے سنا ہے۔ آپ نے اپنے ملک کے وزیر خادجہ کو گرفتار کرا دیا ہے۔"

"ہاں! اس لیے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو۔ آپ کو انھیں رہا کرنا ہو گا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"
"اس سورت میں ہمارے آپ کے تعلقات خوش گوار نہیں رہ جائیں گے۔"

"تو وہ پہلے ہی کب خوش گوار رہے ہیں۔ آپ میری موت کی سازش کریں اور میں آپ سے خوش گوار تعلقات بحال رکھوں۔" صدر صاحب ہوئے۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔"
 "ہاں! یہی بات ہے۔ اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔
 اسے جیل جانا ہو گا۔ اور عدالت بھی اسے پھانسی سے
 کم سزا نہیں دے سکتی۔"
 "اگر ایسا ہوا تو اس کا انجام بہت بھیانک ہو
 گا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔

"دیکھا جائے گا۔" صدر صاحب بولے۔

"تو یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں بالکل!"

"آپ اپنے اس آخری فیصلے پر پچھتائیں گے۔"
 "چلیے کوئی بات نہیں۔ ہم پچھتائیں گے۔ لیکن
 اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

اور دوسری طرف سے جھلا کر ریسیور دکھ دیا گیا۔
 مجرم کو اسی روز فوری سماعت کی عدالت میں پیش کیا
 گیا۔ ساری صورت حال عدالت کو بتائی گئی۔ عدالت
 نے فوراً پھانسی کا حکم دے دیا۔ تاکہ انشا ربہ کوئی
 پکڑ نہ چلا سکے۔ اس پھانسی کا اثنا اثر ہوا۔ انشا ربہ کو
 سانپ سونگھ گیا۔ ملک میں اس کے ایجنٹوں کے رنگ
 اڑ گئے۔ انھیں اپنا انجام قریب نظر آنے لگا۔ سچ

ہے۔ جو صرف اور صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ اس
 سے سب ڈرتے ہیں اور جو اللہ کے سوا دوسروں
 سے ڈرتا ہے۔ اسے سب ڈراتے ہیں اور وہ سب
 سے ڈرتا ہے۔

